نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
استاذ محمّد قطب
ڈاکٹر محمّد بن سعد الرشید
پروفیسر خورشید احمد

نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید

تقاریر

کُل پاکستان تعلیمی کانفرنس

دسمبر ۱۹۷۸ء

- مُفکّرِ اسلام مولانا سیّد ابُو الاعلیٰ مودُودی
- الاُستاذ محمد قطب

استاذ دراستہ العلیا، کلیۃ الشریعہ، مکہ مکرّمہ

- الدکتور مُحمّد بن سعدُ الرّشید

عمید کلیۃ الشریعہ، مکۃ المکرّمہ

- پروفیسر خورشید احمد

سابق وفاقی وزیر ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن

حکومت پاکستان۔

شُعبۂ مطبُوعات:

تنظیمِ اساتذۂ پاکستان ۸۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔لاہور

جملہ حقوق بحق تنظیم اساتذہ پاکستان محفوظ ہیں

طابع وناشر: ــــــــ نصیر الدین ہمایوں

باہتمام: ــــــــ سلیم احمد فاروقی

مقامِ اشاعت: ــــــــ ۸-اے ذیلدار پارک، اچھرہ-لاہور

طبع فی المطبعة العربیة

۳۰-لیک روڈ، بالمقابل منشی چیمبر، پرانی انارکلی، لاہور-پاکستان

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 040965
★ MAILSI ★

اشاعتِ اول ــــ اگست ۱۹۷۹ء ــــ ۲۰۰۰

قیمت فی کاپی ــــ چار روپیہ

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

کتابت ــــ محمد صدیق چاہ میراں لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

ترتیب

- حرفِ آغاز ——— ناظمِ کانفرنس ۵

۱- معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

——— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۷

۲- موجودہ نظامِ تعلیم سے اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف

——— الاستاذ محمد قطب ۱۷

۳- آج عالمِ اسلام کی نگاہیں پاکستان پر لگی ہوتی ہیں

——— الدکتور محمد بن سعد الرشید ۲۹

۴- نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید

——— پروفیسر خورشید احمد ۳۴

حرفِ آغاز

وہ ساعت کتنی سعید تھی جب اِس ملک کے چند اساتذہ نے یہ عہد کیا کہ وہ اپنی زندگیاں پاکستان میں اسلامی نظامِ تعلیم کے نفاذ کے لیے جدّوجہد کرنے اور نژادِ نو کی تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے وقف کر دیں گے۔ اِس عہدِ وفا کے اُستوار کرنے والوں نے آج سے نو سال پہلے تنظیم اساتذۂ پاکستان کی صُورت گری کی۔ تب کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن یہ تنظیم نہ صرف پاکستان کے دردمند اساتذہ کے دلوں کی دھڑکن بن جائے گی بلکہ عالمِ اسلام کے لیے اصلاحِ تعلیم کی سفیر ثابت ہو گی۔ لیکن الحمدللہ کہ وہ وقت آیا اور پاکستان کی تاریخِ تعلیم کا ایک روشن باب بن گیا۔

۲۷ دسمبر تا ۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کُل پاکستان تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ملک کے طُول و عرض سے دو ہزار سے زائد مندوبین شریک ہوئے۔ ان میں سکُولوں اور کالجوں کے اساتذہ بھی تھے اور یونیورسٹیوں کے فضلاء اور تعلیمی اداروں کے سربراہان بھی۔ یہ سب رنگ و نسل اور زبان کے امتیازات سے بالا ہو کر، جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر یہاں جمع ہوئے تھے اور مساواتِ اسلامی کا بہترین مظاہرہ کر رہے تھے۔ پھر اس مبارک اجتماع سے خطاب کرنے والے بھی عالی مرتبہ اکابرین اور تعلیم و تربیت کے ماہرین تھے۔ ان میں اربابِ حکومت بھی تھے اور اہلِ صحافت بھی۔ علُومِ دینیہ کے فضلاء بھی تھے اور عُلومِ جدیدہ کے رمز آشنا بھی۔ ان میں پاکستان کے مایۂ ناز ماہرِ تعلیم پروفیسر خورشید احمد کا اسمِ گرامی قابلِ ذکر ہے۔ آپ نے کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں "نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید" کے عنوان سے سیر حاصل خطاب فرمایا۔ ہمیں یہ فخر بھی حاصل ہُوا کہ سعودی عرب سے سیّد قطب شہیدؒ کے برادرِ حقیقی الاُستاذ محمد قطب بھی تشریف لے آئے جو آج کل جامعہ ملک عبدالعزیز کے کلیۃ الشریعۃ میں دراسۃ العلیاء کے اُستاذ ہیں، ان کے ہمراہ عمید الکلیہ الدکتور محمد بن سعد الرشید بھی تھے

ان محترم مہمانوں کی تشریف آوری سے کانفرنس میں بہار کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ اور یہ بہار اپنے عروج پر آگئی جب کانفرنس کے مندوبین سے قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے خطاب فرمایا۔ مولانا محترم نے اپنی علالتِ طبع کے باوجود زحمت فرمائی اور نسبتاً طویل خطاب فرمایا۔

یہ چاروں خطبات فی الحقیقت یادگار خطبات ہیں۔ ان میں اسلامی نظامِ تعلیم کی تشریح و تعبیر بھی ہے اور معلّمین کے لیے لائحہ عمل بھی۔ ان کی مستقل حیثیت کے پیشِ نظر انہیں کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ مجموعہ ملّتِ مسلمہ کے اساتذہ اور نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

اِن خطبات کی ترتیب میں پروفیسر عتیق الرحمٰن صدیقی، پروفیسر عبدالغنی فاروق اور پروفیسر مشتاق الرحمٰن صدیقی نے بڑی کاوش فرمائی۔ ہم ان کے بہت ممنون ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل عطا فرمائے اور اسلامی نظامِ تعلیم کے لیے ہماری ان مساعی کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین

نصیر الدین ہمایوں

ناظمِ کُل پاکستان تعلیمی کانفرنس

۸۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

۷ جولائی ۱۹۰۹ء

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!

——— سید ابوالاعلیٰ مودودی

حضرات اساتذہ کرام!

مَیں تہِ دل سے آپ کا شکر گزار ہُوں کہ آپ نے میری بیماری کی رعایت کر کے یہاں تشریف لانے کی تکلیف اُٹھائی۔ اگر بیماری نے مجھے بالکل معذور ہی کر کے نہ رکھ دیا ہوتا، تو مَیں آپ کی کانفرنس کے سارے اجلاسوں میں شریک ہوتا۔ اس لیے کہ میرے دل میں آپ کی اس تنظیم کی بڑی قدر ہے، اور مجھے یقین ہے کہ جو شخص بھی اپنے سینے میں اسلام کے لیے دِل دردمند رکھتا ہے وہ اس کی قدر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کی یہ تنظیم اُستادوں کی کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے۔ جو اپنے گریڈوں، اپنی تنخواہوں اور اپنی ترقیوں کے معاملات سے دلچسپی رکھتی ہو اور انہی کے لیے تگ و دو کرتی ہو، بلکہ یہ ان لوگوں کی تنظیم ہے جو خلوصِ دل کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ مُسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام کی تعلیم دیں اور ان کے اذہان کی اصلاح کریں۔ یہ اس لحاظ سے بھی بے انتہا قابلِ قدر ہے کہ اس میں پرائمری سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے اُستاد برابری کے ساتھ شریک ہیں۔ ان کے باہمی تعاوُن میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں کہ کون بڑا اور کون چھوٹا ہے یا کون اُونچا ہے اور کون نیچا ہے۔ صرف اللہ کے دین کی خدمت کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ یہ اِس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ پاکستان کے دُور دراز گوشوں تک کے اُستاد اس میں جمع ہیں اور صُوبوں، علاقوں، نسلوں یا زبانوں کے فرق کو اُنہوں نے یہ مقام نہیں دیا کہ وہ ان کے حقیقی تشخُص پر اثر انداز ہوں۔

فی الحقیقت جو قوتیں پاکستان کی سالمیّت کو برقرار رکھنے والی ہیں ان میں سے ایک بڑی اہم اور زبردست قوت یہ ہے کہ پاکستان کے ہر حصّے میں نئی نسل کی تعلیم و تربیت کرنے والے اور

اس کو ذہنی تربیت دینے والے وہ لوگ ہوں جو خود ہر قسم کے علاقائی، نسلی اور لسانی تعصّبات سے پاک ہوں۔ ایسے ہی لوگ اس ملک کو متحد رکھ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر درسگاہوں میں ہی تعصّبات کا زہر پلایا جانے لگے تو اس ملک کو جمع رکھنے والی کوئی طاقت رہ جاتی؟ آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ تعلیم اور اساتذہ دونوں کے مجموعی نقص کی بدولت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ ہو گیا اور جب معاملات کو اس حد تک بگاڑ دیا گیا تو پھر فوج بھی اس کو نہیں بچا سکی۔ یہ نتیجہ تھا دوسری چیزوں کے علاوہ اس بات کا، کہ ایک مدّت تک نظامِ تعلیم بھی غلط رہا اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو ایسے اُستادوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا جو ان کے اندر کوئی اسلامی حس باقی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان گیا تو ایک مجلس میں ایک پروفیسر صاحب سے بات ہوئی۔ وہ پروفیسر مسلمان تھے ماشاء اللہ۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ پُوری تاریخ میں مسلمانوں کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہیں ہے۔ مَیں نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ——— حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اپنی نئی نسلوں کو ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیتی ہے، وہ گویا خودکشی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اساتذہ کی تنظیم پاکستان کے لیے بڑی قیمت رکھتی ہے کہ اس میں ہر حصّے اور ہر علاقے کے اساتذہ جمع ہیں اور ایک ہی مقصد کے لیے جمع ہیں کہ نئی نسلوں کو اسلام کی تعلیم بھی دی جائے، اسلام کے مطابق ان کی تربیت بھی کی جائے اور ان کے ذہن پاک اور صاف کیے جائیں۔

اس موقع پر اپنی بیماری کی وجہ سے میں کوئی مفصّل تقریر تو نہیں کر سکتا، صرف چند باتیں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایک حقیقی اُستاد کوئی پیشہ ور کتابیں پڑھانے والا آدمی نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ ایک مشنری ہوتا ہے۔

محض روزی کے لیے جس طرح اور کام کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح سے یہ اُستادی کا کام بھی کر لیا، حقیقی اُستاد کی یہ پوزیشن نہیں ہوتی۔ حقیقی استاد وُہی ہے جس کی زندگی کا یہ مشن ہو کہ جو علم ہم کو اپنے اگلوں سے پہنچا ہے، جو تہذیب، جو عقائد، افکار، عادات، خصائل، جو کچھ بھی ہم کو اپنے اسلاف

سے ملا ہے اس کو ہم آگے آنے والی نسل تک اچھی طرح سے، صحیح شکل میں، عمدگی کے ساتھ اور پوری دیانتداری کے ساتھ پہنچائیں تاکہ کوئی کھوٹ اس کے ساتھ نہ ملنے پائے اور نئی نسل اس راستے پر آگے بڑھ سکے جس راستے پر اس اُمّت کا آگے بڑھنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

تو یہ ایک مشن ہے۔ اور اگر مشنری جذبے سے کوئی شخص معلّم کا کام نہیں کرتا تو وہ ملازم ہے، مُعلِّم نہیں ہے۔

پھر یہ بات بھی اچھی طرح یاد رکھیے کہ معلّم مجسّم تعلیم ہوتا ہے۔ کم از کم اسلامی نقطۂ نظر یہی ہے، اِس لیے کہ ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم، جن کی بدولت ہمیں یہ دین ملا ہے اور جن کی نسبت سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں، ان کی اوّلین خصوصیّت ہی یہ تھی کہ وہ مُعلِّم بنا کر بھیجے گئے تھے ـــــ اور وہ مُعلِّم کیسے تھے، یہ بھی دیکھ لیجیے۔ وہ صرف زبان ہی سے تعلیم نہیں دیتے تھے، ان کی رفتار، گفتار، نشست و برخاست ہر چیز، ان کی زندگی کا ہر فعل اور ان کی تمام حرکات و سکنات، سب تعلیم تھیں۔ اسی طرح سے ایک مسلمان مُعلِّم حقیقت میں مجسّم تعلیم ہوتا ہے۔ اس کی ایک ایک چیز شاگردوں پر اثر ڈالتی ہے۔ وہ صرف کتاب نہیں پڑھاتا اور طالب علم صرف کتاب کا مطالعہ نہیں کرتے وہ اس کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ جس وقت وہ کلاس میں داخل ہوتا ہے، جس وقت وہ پڑھا رہا ہوتا ہے، پڑھانے کے دوران میں جو اس کی روش ہوتی ہے، جو طریقہ ہوتا ہے، پُورے وقت میں یہ تمام چیزیں طلبہ پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ پھر کلاس سے باہر، اپنے گھر میں، بازار میں، اپنے معاملات میں، کسی حالت میں بھی وہ چل پھر رہا ہو، شاگرد اس کی تمام باتوں سے اثر قبول کرتے ہیں۔ ایک گالی دینے والا اُستاد، لازماً اپنے طالب علموں کو یہ سبق دے رہا ہوتا ہے، چاہے وہ زبان سے نہ کہے لیکن عملاً وہ یہ سبق دے رہا ہوتا ہے کہ تم گالی دیا کرو۔ ایک بدمزاج اُستاد، جو ذرا سی بات پر بھڑک اُٹھے اور غصّے میں آپے سے باہر ہو جائے، وہ طالب علم کو یہ سبق دیتا ہے کہ صبر و تحمّل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اپنی مرضی کے خلاف کسی چیز کو برداشت نہ کرو اور جو شخص بھی تمہاری مرضی کے خلاف کام کرے، اس پر برس پڑو۔ یہ ایک دو مثالیں مَیں اس لیے دے رہا ہُوں تاکہ یہ حقیقت ذہن نشین ہو سکے کہ اُستاد، پُورے کا پُورا

اُستاد ہوتا ہے۔ وہ ہمہ تن مُعلّم ہوتا ہے۔ اس کی ہر چیز طالب علموں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھنا اس کا کام ہے کہ وہ معاشرے کو کس قسم کے انسان دے رہا ہے اور کس نوع کے کردار تعمیر کر رہا ہے۔

دُوسری بات میں مختصر طور پر آپ سے یہ عرض کروں گا کہ ایک مسلمان جو سچّے دل سے اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اور جس کے دل و دماغ میں اللہ کا دین رچ بس گیا ہو، وہ جب تعلیم دینے کے لیے جاتا ہے، تو وہ قطعاً اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ نظامِ تعلیم کیا ہے اور کتابیں کیا سکھا رہی ہیں۔ نظامِ تعلیم خواہ کیسا ہی ہو اور کتابیں چاہے کچھ کہہ رہی ہوں، لیکن اگر استاد کوئی نظریۂ حیات رکھتا ہے اور اس نظریّہ پر اعتقاد اور سچّے دل کے ساتھ ایمان رکھتا ہے، تو وہ اس کے مطابق تعلیم دے گا۔ جو کتابیں وہ پڑھائے گا، ان میں جس چیز کو اسلام کے خلاف پائے گا، اس پر تنقید کرے گا اور جو چیز اسلام کے مطابق ہوگی اس کی تائید کرے گا اور اس کو زیادہ سے زیادہ طالب علم کے ذہن نشین کرے گا۔ خالص کافرانہ کتابوں کے ہوتے ہوئے وہ ذہن سکھا سکتا ہے اور طلبہ کے دماغوں میں ایمان اُتار سکتا ہے۔ آخر یہ نظامِ تعلیم جو اِس وقت ملک میں رائج ہے، کونسا اسلامی نظامِ تعلیم ہے؟ یہ ہمیں وراثتاً ملا تھا۔ ہم اس کے اندر تھوڑی بہت لیپ پوت کر کے، اس کا رنگ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس کی حقیقت نہیں بدلتے۔ یہ تقسیم سے پہلے بھی رائج تھا اور تقسیم کے بعد بھی رائج رہا ہے۔ لیکن آخر کیسے ممکن ہُوا کہ انہی کالجوں اور یونیورسٹیوں سے، جہاں مُنکرِ خدا اور منکرِ آخرت بن کر نکلتے رہے تھے وہاں انہی اداروں سے وہ لوگ بھی نکلے ہیں جو نہ صرف ایمان رکھتے ہیں بلکہ اللہ کے دین کا عَلم بلند کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے لیے جدّوجہد کر رہے ہیں۔

یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اگر خُدا کے فضل سے خدا کے دین کے لیے کام کیا جائے تو ایک بدتر سے بدتر نظامِ تعلیم کے اندر بھی کام کرنے والا اپنے نظریّہ کے مطابق کام کر سکتا ہے۔ مغربی ممالک میں جن کالجوں اور جن یونیورسٹیوں سے کمیونسٹ بن بن کر نکلتے رہتے ہیں وہاں کمیونزم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ یہ کام وہاں کے کمیونسٹ اُستاد کر رہے ہیں۔ آپ کے اس ملک میں اگرچہ اسلام کے ساتھ اسلام

سے قطعی کھلا انکار کسی کتاب میں نہ ہوگا، لیکن بے دین اُستادوں نے لوگوں کے اندر بے دینی پیدا کی، اور خدا کے وجود سے، آخرت سے اور رسالت سے انکار کرنے والے پیدا کیے۔ مسلمانوں کی اولاد کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا جو کام انہوں نے کیا، وہ اس کے لیے مقرر نہیں کیے گئے تھے، نہ اس کام کے لیے تنخواہ پاتے تھے اور نہ ان کو وہ نصاب دیا گیا تھا جو قطعی کھلے انکار کی تعلیم دے رہا ہو، لیکن چونکہ وہ خود منکر تھے، اس لیے انہوں نے بہت سے نوجوانوں کو مُنکر بنا ہی دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کر سکتے ہیں تو پھر آپ اپنے نظریہ کے مطابق کیوں کام نہیں کر سکتے۔ نصابِ تعلیم بدلتا رہے گا۔ پروا مت کیجیے کہ کب بدلتا ہے۔ نظامِ تعلیم کب بنتا ہے، اس کی کوئی فکر نہ کیجیے۔ یہ اپنی جگہ اپنے وقت پر ہوتا رہے گا۔ ان کے لیے جدّوجہد کرنے والی طاقتیں موجود ہیں۔ آپ بھی جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہوں کہ اسلامی نظامِ تعلیم یہاں رائج ہو۔ لیکن اس کا انتظار مت کیجیے۔ اس انتظار میں نہ بیٹھ جایئے کہ نصاب اور نظامِ تعلیم بدلے گا تو کام کریں گے۔ آپ کا یہ فرض ہے اور اس کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں کہ جو بھی آپ کے شاگرد ہیں، ان میں آپ ایمان پیدا کریں گے، ان کے اندر اسلامی خیالات پیدا کریں گے، ان کے ذہن کو پاکیزہ بنائیں گے، ان کے ذہنوں سے تمام آلودگیوں کو دُور کریں گے۔ اغیار کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کو ختم کریں گے اور ان کو ایمان و ایقان کی تعلیم دیں گے۔

اسی طرح سے آپ دیکھتے ہیں کہ جو بدکردار اُستاد ہیں، وہ مدّتوں سے اپنے شاگردوں کو بدکردار بنانے میں لگے ہوتے ہیں اور بکثرت کو انہوں نے بدکردار بنایا ہے، ان میں بُرائیاں پیدا کی ہیں، انہیں منشیات کا عادی بنایا ہے اور انہیں بدی اور جرائم کی راہ پر چلایا ہے۔ جب وہ یہ کر سکتے ہیں تو آپ ایسا کیوں نہیں کر سکتے کہ نیک کردار بنائیں اور طلباء کو اخلاقِ صالحہ کی تعلیم دیں۔

ظاہر بات ہے کہ یہ آپ اُس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ خود اپنے اندر اخلاقِ صالحہ پیدا نہ کریں۔ آپ ان کو نمازی نہیں بنا سکتے جب تک کہ خود نمازی نہ ہوں۔ آپ ان کو راست گو نہیں بنا سکتے جب تک کہ آپ خود سچ بولنے والے نہ ہوں اور جھوٹ کبھی آپ کی زبان سے نہ سنا جائے۔

آپ ان کے اندر کوئی پاکیزگی اخلاق پیدا نہیں کر سکتے جب تک وہ پاکیزگی اخلاق آپ کے اندر بھی موجود نہ ہو۔ اخلاق زبان سے نہیں بدلتے کردار سے بدلتے ہیں۔ آپ کے کردار کو دیکھ کر آپ کے طالب علم جو اثر قبول کریں گے محض آپ کی زبانی تبلیغ و تلقین سے وہ اثر نہیں ہوگا۔

تیسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس جدوجہد کو مسلسل جاری رکھیے کہ جو اُستاد بھی اس ملک کے اندر موجود ہیں اور کچھ بھی اسلامی جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں، اُن کو اپنی تنظیم میں شامل کرتے چلے جایئے۔ یہاں تک کہ پاکستان میں صرف دو ہی قسم کے اُستاد باقی رہ جائیں۔ ایک مُنکرِ اسلام اور دوسرے اسلام پر ایمان رکھنے والے۔ ایمان رکھنے والے اُستادوں کی تعداد انشاء اللہ کئی گنا زیادہ نکلے گی، سینکڑوں گنی زیادہ نکلے گی انشاء اللہ! اگر آپ ان کو منظم کر دیں تو اس ملک کی درس گاہوں کو اس ملک کا نظامِ تعلیم بدلنے سے پہلے ہی اسلامی نظامِ تعلیم کا اوّلین ادارہ بنا دیں گے۔ جو لوگ ان درس گاہوں میں بے دینی اور بدکرداری پھیلا رہے ہیں ان کے مقابلے میں جب آپ کے شاگردوں کے اندر صحیح ایمان پیدا ہوگا۔ تو آپ یقین رکھیے کہ اپنی کلاسوں میں ان کے لیے بے دینی کی باتیں کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اپنے شاگردوں کے خیالات درست کر دیئے تو ان کے درمیان وہ چلتے پھرتے شرمائیں گے۔ اس وجہ سے کہ خدا کے فضل سے اکثریت تو اب بھی مسلمان ہے اور اسلام پر ایمان رکھتی ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ایمان منظم ہو ——— اور یاد رکھیے۔ طاقت تنظیم سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک ایک آدمی اپنی جگہ کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن ایمان اور اخلاق کو اگر آپ منظم کر دیں اور پھر ایک منصوبے کے مطابق طلبہ کے اخلاق اور کردار ان کے خیالات اور افکار کی تعمیر شروع ہو جائے تو اس کے بعد حکومت اگر ان بدکردار اور بے دین اُستادوں کو نہ بھی نکالے گی، تب بھی یہ ان اداروں میں اچھوت بن کے رہ جائیں گے۔ طالب علم ان سے دُور دُور رہیں گے، وہ ان کا کوئی اثر قبول نہیں کریں گے اور ان کو خود محسوس ہو جائے گا کہ اب مسلمانوں کے اس معاشرے میں ہماری کیا حیثیت رہ گئی ہے۔

حضرات! یہ اس سلسلے کی آخری بات تھی جو میں نے آپ سے عرض کی ہے۔ چونکہ میری طاقت

اب جواب دے رہی ہے، اس لیے مَیں دُعا پر اپنی بات ختم کرتا ہُوں۔

یا اللہ! یہ تنظیم جو اِس ملک میں آئندہ نسلوں کو ایمان اور اخلاقِ صالحہ کی تعلیم دینے کے لیے قائم ہُوئی ہے، اس کو برکت عطا فرما، اس کو زیادہ سے زیادہ طاقت بخش، اس کے کارکنوں کے دلوں میں سچّا ایمان اور اخلاص پیدا کر۔ اور ان کے اندر یہ اہلیّت اور صلاحیت پیدا کر، کہ یہ ہماری آئندہ نسلوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان اور صالح مسلمان بنانے کے قابل ہو۔

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

(۲)

[۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سینٹ ہال میں تنظیم اساتذہ پاکستان کے زیرِ اہتمام ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس کے بعد اساتذہ کا ایک وفد مولانا محترم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اس ملاقات کی جھلکیاں ہفت روزہ آئین لاہور کے شکریہ کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں]

اساتذہ لاہور میں اپنی ایک روزہ تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں یکجا ہوئے تھے۔ کانفرنس کے ختم ہوتے ہی ان کا ایک وفد مولانا کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ سوالات کا آغاز اساتذہ سے پہلے خود مولانا کی طرف سے ہُوا۔ فرمایا، آپ کا فنکشن کیسا ہُوا؟ کتنے اساتذہ آئے تھے؟ ——— اپنے بارے میں مولانا کی یہ دلچسپی دیکھ کر اساتذہ نے عجب تقویت محسوس کی۔ گفتگو کا سلسلہ چلا تو مولانا نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ اساتذہ میں سے ایک ایک فرد کو اپنی ذاتی زندگی کے ذریعے طلباء کے لیے نمونہ بننا چاہیے۔ انہوں نے اساتذہ کو تلقین کی کہ اگر وہ نئی نسل میں اسلامی سیرت و کردار کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ذاتی زندگیوں میں اس کردار کی مثال بنیں ——— مولانا نے فرمایا: ہماری نوجوان نسل اسلام پر ایمان رکھتی ہے اسے

دینِ حق سے گہرا لگاؤ ہے۔ لیکن اخلاق و تہذیب اور شرافت و انسانیت کو تباہ کر دینے والا ایک سیلاب ہے جو ہمارے معاشرے کو بہائے لیے چلا جا رہا ہے اور ہماری نئی نسل کو بھی بگاڑ کے راستے پر بہالے جانا چاہتا ہے۔ اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصولِ زندگی اور اس کے نظامِ حیات سے اور اسلاف کے شاندار کارناموں سے نئی نسل کو آگاہ کریں، ان کے اندر فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کریں اور ان کی سیرت کردار پر خود اپنے قول و عمل سے اچھے اثرات ڈالنے کی کوششیں کریں۔"

مزید فرمایا: "آپ طلبہ کے اندر حق اور ناحق کی تمیز اور حلال و حرام کا صحیح شعور و احساس پیدا کریں اور اپنے عمل سے حق کو اختیار کرنے اور حرام سے بچتے رہنے کا نمونہ پیش کریں۔

اور پھر جیسے اس مرحلے پر تاریخ اُم سمٹ کر آنکھوں کے سامنے آگئی صاحبِ تفہیم القرآن نے حاضرین کو ایک نظر دیکھا۔ ان کی آواز دلوں پر دستک دے رہی تھی جب وہ کہہ رہے تھے:

"ایک ملت اپنے کردار کی کمزوری کے باعث پستی کی طرف لڑھک رہی ہے۔ آج برما اور فلپائن میں مسلمانوں پر بدترین قسم کا ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن دنیا بھر میں مسلمان اتنی بڑی تعداد اور اہم جغرافی حیثیت رکھنے کے باوجود ظالم کا ہاتھ نہیں روک سکتے۔ پھر اسّی کروڑ مسلمانوں کے مقابلہ میں ۲۵ لاکھ آبادی رکھنے والا اسرائیل جارحیت کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے اور مسلمان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ ذلت و مسکنت ہمارے اندر کچھ یونہی پیدا نہیں ہوگئی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اخلاق کو گھن لگ گیا ہے اور ہماری سیرت کردار کی جڑیں گل سڑ گئی ہیں۔ جو قوم فرض کو فرض جانتے ہوئے اسے ادا نہ کرے حرام کو حرام جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرے، حق کو حق جانتے ہوئے اس سے انحراف کرے، اور باطل کو باطل جانتے ہوئے اس کی پیروی کرے اس میں کبھی یہ طاقت پیدا نہیں ہو سکتی کہ مردانگی کا کوئی کارنامہ اس کے ہاتھوں انجام پائے اور اپنے گھر کو فتح کرنے کے سوا وہ ایک انچ زمین بھی فتح کرے۔

اس تعلیمی کانفرنس میں ملک کے مختلف صوبوں کے اساتذہ آئے تھے۔ مولانا سے ملنے والے وفد میں بھی ان کی نمائندگی موجود تھی۔ اساتذہ نے اپنے تجربات کی روشنی میں علاقائی تعصبات کا ذکر کیا تو مولانا

نے فرمایا: "جو بات خاص طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی ہے وہ یہ ہے کہ نسلی اور علاقائی قومیتیں قوم کو تقسیم در تقسیم کیا کرتی ہیں۔ اس کے برعکس ملّتِ اسلامیہ کا تصوّر ایک ملک ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد کر سکتا ہے۔ یہی وحدت ہمارے اندر مضبوطی پیدا کرنے والی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی بدولت ہم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن سکتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنی اپنی جگہ تعصّب کے رجحانات کو حکمت کے ساتھ طلبہ کے ذہنوں سے نکالیں اور اس کی جگہ ان کے اندر مسلمان ہونے کا شعور بیدار کریں، تاکہ آئندہ نسل جاہلیت کے اُن تعصّبات سے محفوظ رہے جو پہلے ہی ہمارے ملک کے ٹکڑے کر چکے ہیں۔"

موجودہ نظامِ تعلیم سے اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف!

——— الاُستاذ محمد قُطب

حمد و ثنا کے بعد

میرے عزیز بھائیو اور بیٹو! مَیں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہُوں کہ آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہُوا ہُوں، اور اُن اساتذۂ کرام سے خطاب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہُوں جو دلوں میں اسلام کا گہرا جذبہ رکھتے ہیں اور صحیح معنوں میں مسلمان اساتذہ کا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں یہ میرا پہلا دَورہ ہے۔ جب سے یہ مُلک معرضِ وجود میں آیا ہے دُنیا بھر کے مسلمانوں کے دِلوں میں اُمنگیں اور اُمیدیں امنڈتی رہی ہیں اور وہ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کب پاکستان اسلامی ریاست بنے اور یہاں اسلام کا پرچم بلند ہو، اگرچہ ماضی کے سیاسی حالات پاکستان میں نفاذِ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بنے رہے ہیں، مگر اب امید ہے کہ انشاء اللہ یہاں اسلام نافذ ہو کر رہے گا۔

اِسلام ـــ کردار کی ضرورت

میرے بیٹو اور بھائیو! اب ساری دُنیا اسلام کی حاجت مند ہے۔ اسلام صرف مُسلمانوں ہی کی نہیں ہر انسان کی ضرورت بن چکا ہے۔ اگر آج ایک طرف مسلمان اِس بات کے حاجت مند ہیں کہ وہ پھر سے اسلام کی طرف رجُوع کریں، خیرِ اُمّت بنیں اور خلیفۃ ارض اور تمکّن فی الارض کے قرآنی فرائض کو پُورا کریں، تو دوسری طرف عام انسان مسلمانوں سے بھی زیادہ محتاج ہیں کہ اسلام آئے تاکہ وہ اس پریشانی اور حیرانی سے نجات پائیں جس میں ساری دُنیا مبتلا ہے۔ انسان آج دُنیا کے بیشتر حصّوں میں روحانی خلا کا شکار ہے۔ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں سے محرُوم ہے اور نجات کی راہ تلاش کر رہا ہے، مگر اُسے راستہ سجھائی نہیں دے رہا۔ حالانکہ نجات صرف اسلام میں ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ انسان کے

سامنے اسلام پیش کریں لیکن محض لفظوں کی صورت میں نہیں، بلکہ ٹھوس عملی شکل میں۔

صرف کتابیں لکھنے، تقریریں کرنے اور خیالات کا زبانی اظہار کرنے سے ہم انسانوں کو اسلام کی طرف نہیں لا سکتے، چنانچہ یورپ کے بہت سے لوگ جب اسلام کے بارے میں پڑھتے اور سُنتے ہیں اور اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں، تو وہ اسلام کے علمبرداروں اور مبلغوں سے پُوچھتے ہیں کہ اگر اسلام ایسا ہے تو پھر مسلمانوں کی زندگیاں اس سے خالی کیوں ہیں۔ اس لیے ہمارا اوّلین فرض ہے کہ اسلام کو اپنی زندگیوں پر نافذ کریں اور اسے عملی صورت دیں۔ شروع میں بھی اسلام محض باتوں اور زبانی دعووں سے نہیں پھیلا تھا، بلکہ لوگوں نے جب اسلام کے عملی نمونے دیکھے اور اس رنگ میں رنگی ہُوئی چلتی پھرتی زندگیاں دیکھیں تو اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگیِ مبارک کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

آپؐ کے اخلاقِ فاضلہ کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پُوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا: کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن۔ یعنی قرآن ان کے اخلاق کی متشکل صُورت ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو پہلے دل میں اُتارا، پھر عملی زندگی میں اسے نمونہ بنا کر انسانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ پھر اس کی بنیاد پر انہوں نے جو جماعت کھڑی کی وہ بھی دینی تعلیمات کا مثالی نمونہ تھی اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں اسلام کی تاریخ مرتّب کی اور اسلامی تعلیمات کو نمونہ بنا کر دُنیا کے سامنے پیش کیا۔

اُستاد عملی نمونہ بنیں

عُلماء انبیائے کرام کے وارث ہوتے ہیں۔ آپ حضرات بھی اُستاد ہیں، چنانچہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دُنیا میں اسلام کا ماضی کی طرح بول بالا ہو، اسے اقتدار ملے اور قرونِ اُولیٰ کی تمکنت اور شان و شوکت لَوٹ آئے، تو آپ کا فرض ہے کہ پہلے خود اپنے آپ کو اسلام کا عملی نمونہ بنائیں اور پھر اُسے دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ عام آدمی کے مقابلے میں اُستاد پر اس سلسلے میں کہیں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسلام کی ترویج و اشاعت اُستاد کا اوّلین فریضہ ہے۔

اسلام کا تصوّرِ تربیت

میرے بھائیو اور بیٹو! یہ عام سی بات ہے کہ مسلمان اسلام کو جانے اور اُس کے مطابق تربیت حاصل کرے، مگر افسوس کہ عملی دُنیا میں یہ چیز بھی بہت کم نظر آتی ہے بعض لوگ اسلامی تربیت کا محض یہ مفہوم لیتے ہیں کہ عبادات کی حد تک دینداری اختیار کی جائے اور نماز روزہ کی پابندی کر لی جائے۔ حالانکہ اسلام کا تصوّرِ تربیت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ ایک جامع ترین تصور کا نام ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر محیط ہے، اور انسانی زندگی میں جو کچھ پیش آسکتا ہے اُس کے بارے میں ایک معیّن و مخصوص رویّہ رکھتا ہے۔ خُدا کا تصوّر، کائنات، خُدا اور کائنات سے انسان کا تعلق اور ایسے ہی موضوعات کے بارے میں اسلام اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے، چنانچہ ضرورت ایسا نظامِ تعلیم اختیار کرنے کی ہے، جو انسانوں کو اس تصور میں ڈھال دے اور جو لوگ اس کے تحت تربیت حاصل کریں وہ اپنے حواس، تصوّر اور کردار میں انہی نظریات کے پابند ہوں۔

ہم اپنی بات کا آغاز اس سوال سے کرتے ہیں کہ کیا تعلیم اس بات کا نام ہے کہ کچھ معلومات طالب علموں کو فراہم کر دی جائیں یا یہ کسی اور چیز کا نام ہے؟ تو پہلی بات یہ جان لیجیے کہ ہم دو باتوں کے حاجت مند ہیں: ایک تعلیم، دوسری تربیت۔ اور سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی نظامِ تربیت اور اسلامی نظامِ تعلیم کیسے برپا ہو کہ عالمِ اسلام کے تعلیمی اداروں میں ان دو چیزوں کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے تعلیم کے معاملے میں ہم نے مغرب کی پیروی کی ہے اور وہی انداز اپناتے ہیں جو وہاں کے تعلیمی اداروں نے اختیار کر رکھے ہیں۔ تربیت کو ہم نے سرے سے نظر انداز کیا ہے اور اگر کہیں اس کی رمق موجود بھی ہے تو میری نظر میں وہ اسلامی تربیت نہیں ہے۔

اسلامی تربیت وعظ و تقریر کا نام نہیں

جب ہم اسلامی تربیت کی بات کرتے ہیں تو بعض لوگوں کا ذہن وعظ و تقریر کی جانب چلا جاتا ہے، حالانکہ اسلامی تربیت کا مدار وعظ اور تقریر پر نہیں ہے۔ اسلامی تربیت کا پہلا وسیلہ معلّم کا کردار ہے۔ اور نصیحت کا عمل کردار کے بعد شروع ہونا چاہیے۔ یعنی بچّوں کو جن اُمور کی تربیت دینا مطلوب ہے،

مُعلّم ان کا عملی نمونہ پیش کرے، بالفاظِ دیگر اگر ہم اپنی نسلوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے مسلمان مُعلّم بننا چاہیے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ پرائمری سکول سے یُونیورسٹی کی سطح تک تمام تعلیمی اِداروں میں اسلامی اسپرٹ جاری وساری ہو اور سارے ماحول پر اسی کا غلبہ وتسلّط ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اساتذۂ کرام اسلام کو اپنی زندگیوں پر نافذ کریں، پھر طالب علموں اور نوجوانوں کے دل خود بخود ان تعلیمات واعمال کی طرف کھنچنے لگیں گے۔ مختصر یہ کہ ہر مُسلمان مُعلّم داعی ہے۔ اس کا فرض ہے وہ اسلام کی دعوت کلاس رُوم کے اندر پیش کرتا رہے نصیحت سے نہیں عملی کردار سے۔ مُعلّم کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمل وکردار سے دائرے کا مرکز بن جائے اور طالب علم اس کے گرد گھُومتے اور متاثر ہوتے رہیں۔ وہ اپنے عمل سے جس چیز کو پیش کرے، طلبہ اس کو اختیار کرلیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جب طالب علم مُعلّم کو شعائرِ اسلام کی پابندی کرتے ہُوئے دیکھیں گے، اسے اسلامی اخلاق کا نمونہ پائیں گے تو خود بخود جان لیں گے کہ اسلام کیا ہے اور اس کی خوبیاں کیا ہیں؟

تعلیم کا مقصد۔ عبُودیّتِ الٰہی

اب کچھ باتیں اسلامی تعلیم کے بارے میں:۔ اسلام میں تعلیم اِس بات کا نام نہیں کہ چند معلومات طالب علموں کے ذہن میں بھر دی جائیں اور بس۔ اسلام میں ہر چیز ایک مقصد کی طرف جاتی ہے۔ یہاں علم برائے علم کا کوئی تصوّر نہیں، چنانچہ اسلام کی نظروں میں علم انسانی زندگی کا ایک جزو ہے اور انسانی زندگی کا مقصد از رُوئے قرآن وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ط اللہ تعالیٰ کی عبادت قرار دیا گیا ہے، اس لیے اسلام میں علم وہی مستحسن ہے جو انسان کو خالقِ کائنات کا سچا وپکّا عبادت گزار بنا دے لیکن عبادت چند اسلامی شعار اور اقوال کا نام نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ دینی مراسم زندگی کا جزو ہیں، مگر عبادت اپنے اندر ایک جامع مفہوم رکھتی ہے اور پُوری زندگی پر حاوی ہے۔ اسی قسم کی عبادت کا مفہوم سمجھانے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط یعنی انسان کی عبادت، اس کا جینا، اس کا مرنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے۔

عبادت کا یہ وسیع تصوّر یُوں پُورا ہوگا کہ انسان پُوری زندگی میں اسلام کے اصولوں کی پابندی

کرے، لہٰذا تعلیم کا مقصد اور ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسا انسان تیار کرے جو اسلام کے اس مفہوم کے مطابق عبادت گزار ہو اور اس کا رکوع و سجود ہی نہیں، بلکہ موت و حیات کا مقصد محض اللہ کی رضا جوئی قرار پائے۔ یہ امر اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم پہلے کچھ سوالات کے جوابات حاصل کریں۔

چند سوالات

اس سلسلے کا پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کیا چیز ہے؟ کیا یہ خدا ہے یا حیوان، فرشتہ ہے یا مخلوق؟ اگرچہ بظاہر اس کا جواب بڑا آسان ہے، مگر دورِ حاضر کے جاہلی نظاموں نے اسے پیچیدہ بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر ڈارون نے اس کا جواب یہ دیا کہ انسان دراصل حیوان ہے اور اسی نظریے کو موجودہ جاہلیت نے من و عن قبول کر لیا۔ ظاہر ہے اگر انسان کا تعلق حیوانی نسل سے ہے تو پھر اسے کسی عقیدے، اخلاق یا روحانی اقدار کا پابند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ آج جب آپ انسان کو دین، اخلاق اور اعلیٰ اقدار سے محروم دیکھتے ہیں تو اس کا سبب یہی بنیادی تصور ہے کہ انسان حیوان ہے، چنانچہ اسلامی نقطہ نظر سے مذکورہ سوال کا جواب دینا بہت ضروری ہے اور بے حد اہم بھی۔

دوسرا سوال ہمارے پیشِ نظر یہ ہے کہ کائنات کے اندر انسان کا کیا کردار ہے اور اسے کون سے فرائض انجام دینے ہیں؟ کیا اس کا کام محض یہ ہے کہ کچھ فائدے حاصل کرے، کچھ چیزوں سے لذت اندوز ہو؟ یا اس کا صرف ایک ہی فریضہ ہے کہ دنیا کو آباد کرے یا تھوڑے عرصے کے لیے جیے اور پھر ختم ہو جاتے؟ اس سوال کا جواب بھی پہلے سوال سے کم اہم نہیں اور دراصل یہی جواب انسان کے اُس طریقِ کار کا تعین کرے گا جو دنیا میں اُسے انجام دینا ہے۔

بدقسمتی سے اگر پہلے سوال کا جواب جدید جاہلیت نے یہ دیا کہ انسان حیوان ہے تو دوسرے کا جواب یہ دیا کہ انسان خوب جیے، جی بھر کر زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہو اور اس امر کی ہرگز پروا نہ کرے کہ اسے کہاں جانا ہے اور مرنے کے بعد اس کا کیا انجام ہونا ہے؟ چنانچہ آج تعلیمی اداروں میں یہی تعلیم دی جا رہی ہے کہ انسان محض لذت و لطف کے لیے پیدا ہوا ہے اور بس۔ نتیجہ یہ کہ اس تعلیم

کا پروردہ انسان مادی مفادات حاصل کرنا اور جاو بے جا طریقوں سے لذّت اندوزی حاصل کرنا انسانیت کی معراج سمجھتا ہے اور یہی اس کے نزدیک زندگی کا مقصد ہے۔ آج مغرب کے تمام تدریسی ادارے انسان کو محض دو مقاصد حاصل کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں: مادّی فوائد اور حصُول لذّت جس کے زیرِ اثر سارا مغرب لذّت اندوزی اور حصُولِ منفعت میں غرق ہے اور اخلاقی و روحانی قدروں کا وہاں دُور دُور تک سُراغ نہیں ملتا۔

سوالوں کے جوابات

آیئے دیکھیں کہ اسلام ان دونوں سوالوں کا کیا جواب دیتا ہے کہ اسی جواب پر اسلامی تعلیم اور تربیت کا دارومدار ہے۔

قرآن کی طرف رجوع کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انسان ہرگز حیوان نہیں، بلکہ کبھی نہ تھا اور اسلام کا انسان ڈارون کے انسان سے بالکل مختلف و ممتاز شے ہے۔ پہلے ہی دن اسے بطورِ انسان تخلیق کیا گیا جس کا پتہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط کے قرآنی فیصلے سے ہوتا ہے یعنی انسان کا مقصد خلافتِ الٰہی قرار پایا۔ اسے زمین پر اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا اور فرض یہ سونپا گیا کہ وہ اللہ کی منشا کو اختیار اور نافذ کرے گا۔ بلاشبہ یہ نظریۂ حیات موجودہ جاہلی تصورِ زندگی سے یکسر مختلف ہے جس پر آج کی دنیا عمل پیرا ہے۔

معلومات کو پیش کرنے کا اسلامی و غیر اسلامی انداز

بادی النظر میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم تو نام ہے فزکس کیمسٹری، میڈیکل اور انجینئرنگ کا۔ پھر اسلامی نظریات کی مطابقت ان سے کیسے ہو سکے گی۔ کیا اسلامی اداروں میں ان کی صُورت اور معلومات مختلف ہو جائیں گی؟ تو میرے بیٹو اور بھائیو! اسلامی طرزِ تدریس میں ان مضامین کی معلومات مختلف نہیں ہونگی، بلکہ ان کے پیش کرنے کا انداز مختلف ہو گا۔ مثال کے طور پر شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ مغرب کا طرزِ تعلیم بُت پرستی پر اُستوار ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو متذکرہ علُوم کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو بار بار اس بات کا اعادہ نظر آئے گا کہ نیچر یا فطرت

ہی خالق ہے۔ افسوس کہ اسلامی ممالک میں بھی اسی مشرکانہ اور بُت پرستانہ نظریے کو اختیار کر لیا گیا ہے اور ہم اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیتے ہوئے ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے کہ نیچر یُوں کرتا ہے، نیچر دُوں کرتا ہے، نیچر کے قواعد اٹل ہیں اور یہ بدل نہیں سکتے۔ غرض ہم طلبہ کو نیچرل لاز (قوانینِ فطرت) کی تعلیم ہی دیتے ہیں اور اپنے عمل اور قول سے نیچر یا فطرت کو خُدا اور خالق بنا لیتے ہیں اور تمام سائنسی اصُول اور کُلیے اسی کی بنیاد پر اُستوار کرتے ہیں۔

یہ طرزِ عمل ایک مسلمان اُستاد کے شایانِ شان نہیں ہے، جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اللہ تعالیٰ کو خالق و رب العلمین نہیں مانتا۔ مَیں یہاں پر دو سائنسدانوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ڈارون کی اور مشہور ماہرِ چشم ابن الہیثم کی۔ ڈارون اپنے نظریات کی بنیاد فطرت پر رکھتا ہے اور خالقِ کائنات کو بالکل فراموش کر دیتا ہے، جبکہ ابن الہیثم اپنے خیالات و نظریات کی تشریح کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرتا ہے اور خالقِ اکبر کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ جاہل عالم اور مسلمان عالم کے درمیان یہی فرق ہے۔ دونوں کی معلومات میں کوئی فرق نہیں۔ مگر معلومات کو پیش کرنے کا انداز کلیتہً مختلف ہے۔ علمی معلومات میں کوئی تغیر نہیں آیا کرتا، نہ ہمارے ہاں، نہ ان کے ہاں، مگر موقف دونوں کا الگ الگ ہوتا ہے۔

بالکل یہی مثال تعلیم پر لاگو ہوتی ہے، چنانچہ جب ہم موجودہ تعلیم کو اسلامی تعلیم میں بدلنے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم کیمسٹری، فزکس وغیرہ میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، بلکہ بُت پرستانہ رویّے ترک کر کے اس کے اندر اسلامی رُوح پیدا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جو لڑکے طالب علم سارا دن کلاس رُوم اور لیبارٹریوں کے اندر "نیچر ہی خالق ہے، نیچر کے قوانین اٹل ہیں" قسم کی باتیں سُنتا رہتا ہے اور اس کے کانوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی صناعی و قوت کی بات نہیں جاتی، اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ اخلاق، اَقدار یا اعلیٰ اصُولوں کا حامل بنے گا عبث اور فضول ہے۔ نیچر ایک ایسا "خُدا" ہے جس کے سامنے کوئی عقیدہ ہے نہ اُصول۔ اس کے برعکس جو طالب علم دورانِ تعلیم یہ پڑھتا رہے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی نے کائنات کو پیدا کیا ہے، وہی ساری مخلوقات کا مالک، رازق اور رہنما ہے، وہ اپنے اندر دینی رُوح پیدا ہوتی ہوئی محسوس کرے گا اور اللہ سے اس کا تعلق گہرا اور محبت مضبوط ہوتی جائے گی۔

عمرانی علوم اور اسلام

یہ تو ان علوم کی بات تھی جو انسانی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں، لیکن عمرانیات میں معاملہ مختلف ہے۔ یہاں اسلام کا نقطۂ نظر خالص انداز میں سمویا جا سکتا ہے۔ ان علوم میں تاریخ، ادب اور اقتصادیات کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جن میں چونکہ انسانی نقطۂ نظر بار بار مداخلت کرتا ہے اس لیے انہیں اسلامی تعلیمات کا علمبردار و ترجمان بنایا جا سکتا ہے، لیکن اس وقت یہ علوم ہم اپنے بچوں کو جس انداز میں پڑھا رہے ہیں وہ سراسر مغربی طریقہ ہے۔ میں مذکورہ تینوں علوم کی ایک ایک مثال پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہوں۔

پہلے تاریخ کو لیجیے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات کو بیان کر دینے کا نام ہے حالانکہ فی الحقیقت یہ واقعات کی تعبیر کا نام ہے۔ تاریخ دراصل انسان کی تاریخ ہے اور جب تک یہ طے نہ ہو کہ انسان کیا ہے، اس کا مقام کیا ہے، اس وقت تک تاریخ سے انصاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ فرعونی تہذیب تھی، یہ یونانی تہذیب تھی اور یہ رومی تہذیب تھی، اور پھر ان کے تہذیب و تمدن کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان سب کو "جاہلیت" قرار دیتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ پاک میں انسان کا جو مقصدِ حیات "بندگیٔ رب" قرار دیا ہے، وہ ان نام نہاد تہذیبوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اسی لیے جب مسلمان مؤرخ یا معلم اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرے گا تو وہ مثال کے طور پر اگرچہ فرعونی تہذیب کی مادی ترقی کا اعتراف کرے گا، مگر وہ ضرور بیان کرے گا کہ فرعون اللہ کا بندہ نہیں، بلکہ خود خدا بن بیٹھا تھا۔ اُس دور میں انسان غیر خدا کے بندے بن گئے تھے اور یوں فرعونی تہذیب میں مصر کا انسان اللہ کی عبودیت کا مقصد پورا نہیں کر سکا تھا۔ بس یہی اختلاف جاہلی تاریخ اور اسلامی تاریخ کے درمیان واقع ہے کہ جاہلی مورخ فرعونی تہذیب کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا اور لکھے گا کہ اس دور کے انسان نے اپنی خودی کا اظہار بہترین طریقے سے کیا مگر مسلمان مؤرخ کے نزدیک اس دور کا انسان گمراہ تھا اور سرتاسر جاہلیت میں ڈوبا ہوا تھا۔

اب اجتماعیات (سوشیالوجی) کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ علم الاجتماعیات کا مشہور ماہر اور فلسفی

درگائین فرانس کا یہودی تھا۔ اُس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دین اور اخلاق کی حیثیت مستقل بالذات نہیں، نہ یہ ہمیشہ قائم و ثابت رہ سکتے ہیں۔ یہ تصورِ اسلامی تصورِ اخلاق و مذہب سے بنیادی طور پر متصادم ہے، مگر ایک عرصے سے درسگاہوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔ جب ہم تعلیم کو اسلامی رنگ دیں گے تو یہ غیر حقیقی اور غیر اسلامی نظریات ختم کر دیے جائیں گے اور اجتماعیات اور دیگر عمرانی علوم کو دینی عقائد سے ہم آہنگ کیا جائے گا۔

اقتصادیات کا علم بھی انسانی نظریات کے تابع ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو بتانا ہے کہ سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام اور اشتراکیت کا اقتصادی نظام دونوں غیر فطری و غیر انسانی بنیادیں رکھتے ہیں، جبکہ ان کے مقابلے میں اسلام کا اپنا اقتصادی نظام ہے اور وہ دونوں سے مختلف اور انسان پرور ہے۔

علمِ نفسیات میں انسانی نفس کا جزوی تجزیہ کر کے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ انسان کو کیسا ہونا چاہیئے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ انسان کیا ہے؟ اس وقت نفسیات کی تدریس خالصتاً مغربی طریقے سے کی جا رہی ہے اور ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسلامی علم النفس دینی تعلیمات پر اُستوار ہوگا، تاہم یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مَیں صرف آؤٹ لائن دے رہا ہُوں۔

میرے بیٹو اور بھائیو! تاریخ، اجتماعیات اور اقتصادیات و نفسیات کی طرح تعلیم و تربیت کا علم بھی مغربی تصوّرات پر مبنی ہے اور کہا جاتا ہے کہ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد انسان کو اچھا شہری بنانا ہے، جبکہ اسلام کا تصورِ تعلیم پہلے ہی قدم پر اس سے اختلاف کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم کی اوّلین اور سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صالح انسان پیدا کرے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اچھا شہری اور صالح انسان ایک ہی بات ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں، لیکن درحقیقت دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں وہ سرمایہ دار اچھا شہری ہے جو اپنے کاروبار کو وسعت دیتا رہے، خواہ وہ کتنے ہی مظلوموں کا خون نچوڑ ڈالے۔ وہ سفید فام شہری اچھا ہے جو بے گناہ سیاہ فام کو مار ڈالے۔ اور وہ امریکی بھی اچھا شہری ہے جو دنیا بھر میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتا پھرے، کمزوروں کو مصائب کا شکار بناتا رہے، مگر امریکی مفادات کا تحفظ کرتا ہو۔ اسی طرح رُوس میں وہ شخص اچھا شہری ہے جو اپنے دل و

دماغ اور ضمیر کو کمیونسٹ پارٹی کے شکنجے میں کسے رکھے۔ اسی طرح وہ رُوسی بھی اچھے شہری تھے جو ۱۹۵۶ء میں ٹینک لے کر ہنگری گئے اور انہوں نے وہاں کے باشندوں کو محض اس لیے کچل ڈالا تھا کہ وہ آزادی کے خواہاں تھے۔

غرض ہر مُلک میں اچھے شہری کی مختلف تعریف رائج ہے، مگر بنیاد میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے یعنی وطن اور قوم کی پرستش، اسے معبُود کے درجے پر فائز کرنے کا عزم، جبکہ اس کے مقابلے میں صالح انسان یا مسلمان صرف خُدا کا بندہ ہے۔ وہ وطن کی پُوجا نہیں کرتا، نہ اس کی خاطر کسی ظُلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی لیے ایک صالح انسان خواہ کہیں بھی چلا جائے، اس کا رویّہ یکساں ہوگا کہ اس کی نظر میں خُدا ہر جگہ موجود ہے اور اس کی ایک ایک حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔

میرے بھائیو اور بیٹو! آپ نے دیکھ لیا کہ ان تمام عُلوم سے ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے اختلاف ہے اور اگر ہم انہیں اسلامی رنگ دینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے نئے الفاظ، نئی تراکیب اور نئے طریقے اختیار کرنے ہونگے۔ یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔

اسلامیات کے پیریڈ بڑھا دینا کافی نہیں

آخر میں ہم یہ دیکھیں گے کہ ان عُلوم میں اسلام کا کتنا حصّہ ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محض اسلامیات کے پیریڈ بڑھا دینے سے اسلامی نظامِ تعلیم کا مقصد پُورا ہو جائے گا۔ بالفرض اگر ایسا کر بھی دیا جائے، مگر دُوسرے مضامین اور عُلوم کا انداز وہی رہے تو اسلامیات کے ان پیریڈوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے لیے مَیں اپنے ملک مصر کی مثال پیش کرُوں گا۔ وہاں اسلامیات کے پیریڈ میں بچّوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ فرعون خدا کا باغی تھا، ظالم تھا۔ مگر تاریخ کا اُستاد اسے ایک عظیم انسان کے رُوپ میں پیش کرتا ہے جو واقعی اتنا اعلیٰ و برتر تھا کہ خدا بننے کے قابل تھا۔ اسی طرح ہم دینیات کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ خدا خالق ہے، مگر دوسرے عُلوم میں نیچر یا فطرت کو اس رُتبے پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ سائنسی عُلوم میں طبعی قوانین اور نیچر کو اٹل قرار دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ خدا بھی ان کو بدلنے پر قادر نہیں ہے اور اسی سبب سے مغربی ذہن مُعجزات کا انکار کرتا ہے کہ یہ امر علمِ طبیعیات کے خلاف ہے۔ نتیجہ اس

صورتِ حال کا یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کا ذہن تضاد کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا۔

دینیات کی تعلیم میں دوسری مشکل یہ ہے کہ بچے کو کچھ آیات رٹائی جاتی ہیں اور کچھ عبادات کا تعارف ہوتا ہے۔ تعلیم کا یہ طریقہ ہمیں قرونِ اُولیٰ سے ورثے میں ملا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کے مناسبِ حال بھی تھا، جبکہ اس وقت اسلامی قانون نافذ تھا، معاشرہ اسلامی تھا اور گھر کے اندر دینی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اُس دَور میں مدرسہ میں صرف عبادات و فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور یُوں یہ ریاست و معاشرت کی تکمیل کر رہا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ اب گھر کے اندر اسلامی تربیت کا انتظام ہے نہ معاشرے میں، اور نہ خُدا کا قانون نافذ ہے، اس لیے طالب علم کلاس رُوم سے جب قرآنی آیات اور فقہ کے اسباق پڑھ کر باہر نکلتا ہے تو اسے سب کچھ مختلف اور غیر حقیقی نظر آتا ہے اور دینی احکام و مسائل کو ناقابلِ عمل سمجھنے لگتا ہے۔ کاش یہ تفاوت دُور ہو۔

تیسری بات میں یہ کہوں گا کہ دینیات کے نصاب میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک اس پیریڈ کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلباء میں دین کا احساس، شعُور اور محبت پیدا ہو اور اس کے لیے مثالی (آئیڈیل) طریقہ وہ ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ بار بار زمین و آسمان کے مشاہدے کی دعوت دیتا اور انسان کو اپنے آپ پر غور کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس سے دراصل اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی طرف متوجہ کرتا اور انسانی ذہن میں دینی حس بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ مُجرّد فقہ کے اُصول یا عبادات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ بھی اختیار کیا جائے تو پھر جو عُلوم بھی پڑھائے جائیں گے، سارے اسلامی بن جائیں گے۔ اس کے لیے اساتذہ ایسے ہونے چاہییں جو خود دین سے عملی شیفتگی رکھتے ہوں اور سبق کے الفاظ ان کے دل سے نکل رہے ہوں۔

میرے بیٹو اور بھائیو، مَیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ مَیں نے بڑا وقت لیا ہے مگر یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر تفصیل ہی سے بات ہونی چاہیے۔ تعلیم وہ کارگر آلہ ہے جس کے ذریعے ہم اسلامی معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں اور اگر ہم فی الواقع اسلامی شوکت کا احیاء چاہتے ہیں تو اسلامی تعلیم و تربیت کا مثالی نظام بحال کرنا پڑے گا۔ یہ کام بہت ہی اہم ہے اور فوری توجہ کا مستحق بھی۔

آج عالمِ اسلام کی نگاہیں

پاکستان پر لگی ہوئی ہیں

الدکتور محمّد بن سَعد الرّشید

مَیں اپنے بھائیوں سے تبادلۂ خیال کرنے اور آپ سے استفادہ کرنے کے لیے یہاں آیا ہُوں۔ میرے لیے یہ امر باعثِ مسرّت ہے کہ مَیں اس موقعہ پر پاکستان کی ایک اہم شخصیت جناب چیف جسٹس انوار الحق سے بھی ملاقات کر رہا ہُوں۔ اور میرے لیے یہ بات بھی خوشی کا باعث ہے کہ مَیں اُن لوگوں سے مُخاطب ہو رہا ہُوں جو پاکستان کے گوشے گوشے سے یہاں آکر جمع ہو گئے ہیں۔

پاکستان تصورِ اسلام کا رہینِ منّت ہے۔ اور یہ اس لیے عالمِ وجود میں آیا تھا کہ یہاں اسلام کی حکمرانی ہو گی۔ یہ ملک دُوسرے ممالک کے مقابلے میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور برِ اعظم ایشیا میں خاصی اہمیّت کا حامل ہے اس لیے اس کی حفاظت اسلام کی حفاظت کے مُترادف ہے۔ مُعلّم کی حیثیت سے اس کے تحفّظ کی زیادہ تر ذمّہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ مَیں دُوسرے مُقرّرین کی طرح مُعلّم کے پیغام، منصب اور اہمیّت کے بارے میں تفصیلی اظہارِ خیال نہیں کرُوں گا۔ صرف اتنا کہونگا کہ مُعلّم کی ذمّہ داری یہ ہے کہ وہ اچھی نسل تیار کرے۔ خدا نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے تاکہ اس زمین کو آباد کرے۔ اس آبادی اور تعمیر کا کام اسلام ہی کے ذریعے سر انجام پا سکتا ہے۔ علم دو دھاری تلوار کا نام ہے۔ عُلوم خیر کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں۔ اور شر کا باعث بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر ایک مسلمان مُعلّم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان علوم کو خیر کا ذریعہ بنائے اور ان سے انسانیت کی تعمیر کا کام لے۔ مُعلّم کے پاس جو پیغام ہے وہ محدود نہیں بلکہ پُورے عالمِ انسانیت کے لیے ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اسلام کو پہلے اپنی زمین پر نافذ کریں۔ اور پھر دُنیا کے سامنے اسے بطور نمونہ پیش کریں۔

ہر مسلمان اِس بات کا گواہ ہے کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کے رسُول ہیں۔

کلمۂ طیبہ کے اس معنی و مفہوم کو ممکن ہے کچھ لوگ نہ سمجھتے ہوں مگر اس کا مقصد یہ ہے کہ اسے عملی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اسلامی شریعت کا نفاذ دوسرے لفظوں میں لا الٰہ الا اللہ کا نفاذ ہے۔ وہ اللہ انسانی ضروریات کو بہتر سمجھتا ہے۔ اور اسی نے ہمیں منتخب کیا ہے کہ ہم اس کے پیغام کو عملاً جاری و ساری کریں۔

یہ موقع کسی تفصیل کا متحمل نہیں اس لیے چند اشارات پر اکتفا کر رہا ہوں۔ بہر حال یہ جان کر مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے کہ حکومتی اور قومی سطح پر نظامِ اسلامی کے نفاذ کا عزم کیا جا رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ ربِ کریم ان مخلصین کی دستگیری فرمائے۔ مَیں جب کبھی یہ سوچتا ہوں کہ مسلمان کس طرح انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ کرتے ہیں کیونکر غیروں کی اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ اور دوسروں کی زبان اور ثقافت کو اپنے لیے نشانِ افتخار تصور کرتے ہیں تو میرا دل مجروح ہوتا ہے اور یہ فقرہ یاد آتا ہے کہ جیسے کوئی فقیر کسی کم ظرف کے دسترخوان پر جا بیٹھے۔ اگرچہ میرا ایمان ہے کہ قرآن کی زبان ہی مسلمانوں کی زبان ہوتی ہے مگر پاکستان میں اُردو زبان کو اپنانے کے لیے جو کوشش ہو رہی ہے یہ بھی قابلِ ستائش ہے اس لیے کہ یہ نظریۂ پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ یہودی اور دیگر استعماری قومیں مسلسل سازشیں کرتی رہتی ہیں کہ مسلمانوں اور ان کی زبان کے درمیان بُعد و بیگانگی پیدا کی جائے جن میں وہ کامیاب رہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہودی و نصرانی اس وقت تک خوش نہ ہوں گے کہ جب تک آپ ان کی پیروی نہ کریں۔

میرے بھائیو! مَیں پاکستان میں دو احساس لے کر آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ ایک احساس کی نوعیت وہی ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے ہوتی ہے۔ دوسرا احساس ایک معلم کا احساس ہے جس کی ذمہ داری اور پیغام اہم ہے۔ مَیں مکہ معظمہ میں کُلّیۃ الشریعہ کا ڈین ہوں۔ یہ ادارہ ایک پاکیزہ ترین جگہ پر واقع ہے۔ اِس اعتبار سے ہماری ذمہ داری اور فرائض بھی زیادہ سخت ہیں۔ ہم نے اپنے کالج میں پاکستانی بھائیوں کے لیے وظیفے منظور کیے ہیں۔ تاکہ آپ عربی زبان پڑھیں۔ مَیں آپ معلّمین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم اسلامی قانونِ تمدن کی تعلیم کے لیے آپ کو وظائف پیش کر سکتے ہیں جس کا اختیار مَیں تنظیم اساتذہ کو دیتا ہوں۔

آخر میں دو باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ وہ یہ کہ مسلمانوں میں تین قسم کے گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو مسلمان ہیں اور اسلام کی سربلندی اور اس کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جسے شیطان نے بہکا دیا ہے اور وہ غلط راہ پر چل نکلا ہے۔ تیسرا طبقہ عام مسلمانوں کا ہے جسے مذبذبین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پہلے طبقے کا فرض یہ ہے کہ وہ روشنی کا سرچشمہ بن کر اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچائے، خواہ وہ اُستاد ہو یا کسی اور پیشے سے تعلق رکھتا ہو۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اسلامی شریعت کے نفاذ کو اپنی ذمہ داری بنا رکھا ہے اور اس کے لیے قربانیاں پیش کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتیں کھپا رہے ہیں۔ ان کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ انہیں تاریخ دوام بخشے گی۔ اور ربِ جلیل قیامت کے دن انہیں بڑا اعزاز بخشے گا۔

میں جانتا ہوں کہ آج مسلمان متعدد مسائل سے دوچار ہیں مگر نیتیں خالص ہوں اور ارادے کھرے ہوں تو وہ کامیاب ہوں گے۔ آج ہر مخلص مسلمان کی نگاہیں پاکستان پر جمی ہوئی ہیں۔ اللہ آپ کی مدد کرے اور کامرانیوں سے ہمکنار کرے۔ آمین

نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید

پروفیسر خورشید احمد

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ - وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ -

صدرِ محترم، مہمانانِ گرامی، اساتذۂ کرام، معزز حاضرین!

مَیں زمین و آسمان کے خالق کا شکر ادا کرتا ہُوں کہ اُس نے پاکستان کے اساتذہ کو یہ توفیق بخشی کہ کسی مادّی منفعت کے حُصول کے لیے نہیں بلکہ اپنے دین، اپنے ملک، اور اس مقدس پیشے کی خدمت کے لیے وہ ملک کے کونے کونے سے اس تاریخی شہر میں جمع ہُوئے اور وہ صرف اس لیے جمع ہُوئے ہیں کہ تعلیم کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ آپ حضرات قابلِ مبارک باد ہیں۔ تنظیم اساتذۂ پاکستان قابلِ صد تحسین ہے کہ اُس نے اِن حالات میں جب لوگ ذاتی منفعت کی پُوجا کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے ہُوئے ہیں، قوم کے سامنے ایک نئی مثال قائم کی۔ کتنی حوصلہ افزا بات ہے کہ وہ استاد جن کی تنخواہیں کم ہیں، جن کے لیے اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی ضروریات پُوری کرنا مشکل ہے، وہ اپنے پیٹ کاٹ کر اور تکلیفیں اُٹھا کر ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اس کانفرنس میں جمع ہوتے ہیں اور اپنی تمام فکر اور اپنی تمام سوچیں اس امر پر مرکوز کر رہے ہیں کہ ہم پاکستان میں تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر کس طرح اُستوار کریں۔

مجھے یاد ہے چند سال پہلے جب یہ تنظیم قائم ہُوئی تھی، چند سرپھروں نے اس بات کا بیڑا اُٹھایا تھا کہ ہمیں وسائل کو نظر انداز کر کے۔ اللہ پر بھروسہ کر کے اور اپنے خلوص پر اعتماد کر کے اس مقصد کے لیے کام کرنا

ہے۔ آج سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ڈیڑھ دو ہزار معلّم یہاں جمع ہیں۔ ہزاروں وہ بھی ہیں جو یہاں آنہیں سکے لیکن اُن کے دل آنے والوں کے دلوں کے ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ تنظیم کے ان پیش رووں Pioneers، کے اس کارنامے کو یاد کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ شعر آرہا ہے کہ ؎

مَیں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے رہے اور کارواں بنتا گیا

خدا کا شکر ہے کہ آج وہ کارواں اپنے مقصد کے حصول کے لیے رواں دواں ہے۔ اور یہ بھی پاکستان کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ اساتذہ، طلبہ، حکومت اور اُس کے نمائندے ایک ہی زبان بول رہے ہیں، ایک ہی مقصد کی طرف قوم کو بُلا رہے ہیں اور شانہ بشانہ پاکستان کو اُس کے حقیقی مقصد کی روشنی میں از سرِ نَو تعمیر کرنے کی جدوجہد میں سرگرمِ عمل ہیں۔ میری دُعا ہے کہ یہ کیفیت نہ صرف باقی رہے بلکہ بڑھے اور بالآخر ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوں۔

برادرانِ محترم! مجھے جس موضوع پر اس وقت اظہارِ خیال کرنا ہے، وہ ہے نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید۔ یہ بات تو سبھی کہتے ہیں کہ ہمیں تعلیم کا مسئلہ درپیش ہے۔ نئے سکول قائم کرو، نئی بلڈنگیں بناؤ۔ جامعات قائم کی جائیں، فنی ادارے کھولے جائیں اور مزید سرمایہ فراہم کیا جائے۔ ان میں سے ہر بات اپنی جگہ ایک صداقت ہے لیکن جس بات کی طرف مَیں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہُوں وہ یہ ہے کہ مسئلہ صرف تعلیم کا نہیں تعلیمی نظام کا ہے۔ وہ ماحول جس میں تعلیم دی جارہی ہے، وہ افراد جن کے ذریعے تعلیم دی جارہی ہے، وہ مضامین اور مطالب جو اس کے ذریعے نئی نسلوں کو فراہم کیے جارہے ہیں، وہ مقاصد جن کے لیے تعلیمی ادارے وجود میں لائے جارہے ہیں، اصل مسئلہ اس پُورے نظام کو دیکھنے، اسے از سرِ نَو مرتّب کرنے اور اِسے ایک صحیح رُخ پر ڈھالنے کا ہے۔ اگر آپ پُورے عالمِ اسلام کا جائزہ لیں اور خصوصیت سے اپنے ملکِ عزیز پاکستان کے تعلیمی کوائف کا جائزہ لیں تو آپ یہ پائیں گے کہ یہاں موٹی موٹی خامیاں ہیں جنہیں جانے بغیر تعلیم کی تشکیلِ جدید کے مسئلے کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ میری ناچیز رائے میں یہ بنیادی خامیاں ہیں:

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد فرد اور قوم کو اُس کے مقصدِ حیات سے روشناس

کرانا اور ملّی مقاصد، تاریخی اقدار، تہذیب اور ثقافت کا شعور دلانا ہے تعلیم اس فکری و ثقافتی سرمائے کی امین بھی ہے اور تعلیم کے ذریعے یہ ثقافت نئی نسل کی طرف منتقل بھی ہوتی ہے۔ بلاشُبہ تعلیم کا یہ کام ہے کہ وہ معلومات فراہم کرے، جدید ترین معلومات سے نئی نسلوں کو آراستہ کرے تعلیم کا یہ کام بھی ہے کہ وہ ہُنرمندی یا Skills, پیدا کرے۔ اور ذہنی حیثیت سے زیرِ تعلیم نسل کو اس لائق بناتے کہ وہ محض کچھ معلومات حاصل کر کے نہ رہ جائیں، بلکہ سوچنے کا صحیح اسلوب پیدا کریں۔ اُن میں ذوقِ نظر پیدا ہو، تنقیدی نگاہ پیدا ہو۔ جو کچھ اُنہیں بتا دیا گیا ہے وہ اسی کو دُہراتے نہ رہیں، بلکہ اُن میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ صحیح انداز میں سوچ سکیں، چیزوں کو پرکھ سکیں، پھر عملی حیثیت سے انہیں وہ Skills, یا ہُنرمندی فراہم کریں جس کے نتیجے کے طور پر وہ زندگی کی کشمکش میں اپنا وظیفہ صحیح طور پر ادا کر سکیں۔ خواہ وہ وظیفہ ایک مُعلّم کا ہو، ایک کلرک کا ہو، ایک چپراسی کا ہو، ایک انجینئر اور ایک ڈاکٹر کا ہو، ایک وکیل اور ایک جج کا ہو، ایک صنعت کار اور ایک تاجر کا ہو، ایک مُدبّر اور ایک سفیر کا ہو۔ غرضیکہ جو کردار Role, بھی وہ ادا کرے، اُسے وہ ٹھیک ٹھیک بلکہ خوب سے خوب تر انداز میں ادا کرے۔ تعلیم کا فرض ہے کہ وہ نوجوانوں میں اس چیز کی صلاحیت پیدا کرے لیکن یہ دونوں کام معلومات فراہم کرنا اور تنقیدی و تخلیقی صلاحیت پیدا کرنا، ایک خاص ماحول اور پس منظر میں واقع ہوتے ہیں۔ یہ ماحول بنتا ہے زندگی کی اقدار، ثقافت اور تمدّن اور اُس دینی فریم ورک سے جس میں انسان کو زندگی گزارنی ہے۔ تعلیم کا مقصد نئی نسلوں کو دینی اور ثقافتی فریم ورک کو سمجھنے، اسے قبول کرنے، اور اس کے مطابق مستقبل کے جو تقاضے ہیں اُن کو ادا کرنے کے لائق بنانا ہے۔ یہ وہ پُوری چیز ہے کہ جسے آپ تعلیم کا مقصد، اس کا مزاج، اُس کا اپروچ، اس کا رسومیہ Ethos, کہتے ہیں۔ اور ایک تعلیمی نظام کا کام یہ ہے کہ جہاں وہ پیمانۂ صغیر Microlevel, پر علم اور ہُنرمندی پیدا کرے، وہیں بحیثیتِ مجموعی، قوم کے اندر نئی رُوح، نیا ولولہ، سوچنے کا نیا انداز بھی پیدا کرے تاکہ وہ اپنی بہترین روایات کی امین بن سکے اور ان روایات کو آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کر سکے، ان کو چار چاند لگا سکے۔ لیکن جو تعلیمی نظام دورِ سامراج میں یہاں قائم ہُوا، اُس نظام نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ جو ہماری روایات

جو تاریخی تعلیمی نظام تھا اُسے تباہ کیا۔

اگر آپ برصغیر کی تاریخ کا مُطالعہ کریں تو آپ یہ پائیں گے کہ اٹھارویں صدی، اُنیسویں صدی کے شروع تک یہاں تقریباً ہمہ گیر خواندگی (Universal Literacy,) تھی جتنی رپورٹیں حتیٰ کہ برطانوی سیاحوں کی، ڈپٹی کمشنروں کی رپورٹیں ہیں، اُن کا مطالعہ کیجیے۔ آپ اُنہیں یہ اعتراف کرتے ہُوئے پائیں گے کہ یہاں اُنہیں کوئی دیہات، کوئی گاؤں ایسا نہیں ملا کہ جہاں مدرسہ موجود نہ ہو، جہاں مسجد موجود نہ ہو، جہاں تعلیم کا اہتمام نہ ہو۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز جہالت کے مقام سے نہیں کیا۔ یونیورسل لٹریسی مسلمان معاشرہ کا ایک شعار رہا۔ سامراجی دَور میں پہلا کام یہ ہُوا کہ اِس تعلیم کے تاریخی اور روایتی نظام کو تباہ کیا گیا۔ پہلا کام تعلیم سے بے بہرہ کرنا Dis-Education, تھا۔ اور دوسرا کام تھا غلط تعلیم Mis-Education, ۔ ایک طرف وہ قوم جس نے اعلیٰ معیارِ تعلیم قائم کیا تھا، اُسے جاہل بنایا گیا اور پھر اُس میں سے ایک طبقے کو ایک ایسی تعلیم دی گئی جس کے نتیجے کے طور پر اُس نے اپنی خودی کو بیچ کر دوسروں کی چاکری میں اپنی معراج سمجھی۔ اس نظام کا مقصد یہ تھا کہ اس برِصغیر کے رہنے والے اپنی روایات کو بُھول جائیں، اپنی اقدار کے باغی ہوں اور سامراجی اقوام کے ذہن سے سوچنے، اس کی آنکھوں سے دیکھنے، اور اس کی زبان کو بولنے لگیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برِصغیر کی اقوام برطانوی روایات، برطانوی تاریخ، برطانوی ادب سے روشناس ہوں اور اپنی تاریخ، اپنے ادب اور اپنی رِوایات کو بُھول جائیں۔ اور پھر اُن کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو کہ وہ سامراج کی مشینری کے دماغ نہیں دل نہیں نگاہ نہیں صرف کل پُرزے بن سکیں۔ یہ تھا وہ نظام جو یہاں قائم کیا گیا اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہی ہے وہ نظام جسے آج ہم چلا رہے ہیں۔ پاکستان کا قیام دُنیا کے معروف نظریات کے خلاف ایک چیلنج بنے دُنیا نے یہ سمجھا کہ قومیں زبان سے بنتی ہیں، جغرافیائی نظام سے بنتی ہیں اور معاشی مفاد سے بنتی ہیں۔ تحریکِ پاکستان نے اسی تصوّر کو چیلنج کیا اور یہ کہا کہ قوم عقیدے سے بنتی ہے۔ دین سے بنتی ہے اور اُس تاریخ اور ثقافت سے بنتی ہے جو عقیدے اور دین پر مبنی ہو۔ لیکن یہ نظریاتی انقلاب سیاسی آزادی کے بعد مکمل نہ ہُوا، جس کے نتیجے کے طور پر اس کے جلو میں جو تعلیمی انقلاب آنا چاہیے تھا وہ نہ آیا۔

آج ہم اکتیس سال ضائع کرنے کے بعد پھر اُس مقام پر کھڑے ہیں اور ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ ہمیں اپنے سفر کا آغاز کس طرح کرنا ہے اور کس سمت میں جانا ہے۔ لیکن مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہُوں کہ کم از کم اکتیس سال کے بعد ہم آج برملا اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ سامراج کا چھوڑا ہُوا یہ نظام ہماری انفرادی اور ہماری قومی ضروریات کو پُورا کرنے کا نااہل ہے۔ اور اگر ہمیں ایک زندہ قوم کی حیثیت سے اُبھرنا ہے تو ہمیں محض جزوی تعلیمی تغیّر کا راستہ ترک کر کے پُورے نظامِ تعلیم کو از سرِ نَو مرتّب کرنے کا کام سرانجام دینا ہوگا ——— یہ ہے سب سے پہلا مسئلہ کہ ہم سامراجی نظام کے ورثے سے جان چھڑائیں اور نیا نظام قائم کریں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم، دو مستقل، متوازی، اور بڑی حد تک ایک دوسرے سے الگ تھلگ Mutually Exclusive, نظاموں کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اور یہ اس قوم کی ایک بڑی بدقسمتی ہے جس نے دُنیا کو یہ نیا نظریہ دیا کہ دین اور دُنیا کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ جس کے نبیؐ نے یہ کہا تھا کہ ساری زمین میرے لیے مسجد ہے۔ جہاں یہ انقلابی تصوّرِ مذہب انسانیت کو دیا گیا کہ محض نماز اور روزہ مذہبی عمل نہیں۔ روزی کمانا اگر وہ حلال روزی ہے، مشینیں بنانا، لشکر کشی کرنا، خندقیں کھودنا، ایجادات و اختراعات کرنا، اگر یہ سب خدا کے حکم کو ماننے کے احساس کے ساتھ ہو، تو یہ عبادت ہے۔ جس دین نے یہ انقلابی تصوّرِ زندگی کا دیا، اُس دین کے پیرو ایسے نظامِ تعلیم پر مطمئن ہو گئے کہ جس میں ایک طرف دینی تعلیم دی جاتی ہے لیکن وہاں دُنیا کے مسائل اور اُمور کی کوئی ہوا نہیں پہنچتی۔ اور دوسری طرف سیکولر بنیادوں پر دنیاوی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اس طرح کہ کوئی اخلاقی حِس بیدار نہیں ہوتی۔ ان تمام عُلوم کا کوئی تعلق زندگی کے مقاصد سے، تمدّن سے مربوط نہیں ہو پاتا اور پُوری قوم ایک انشقاقِ ذہنی Schizo Phrenia, کا شکار ہو جاتی ہے مُنتشر شخصیت Split Personality, پیدا ہوتی ہے جو اہلِ دین ہیں وہ دُنیا کے معاملات میں رہنمائی نہیں کر سکتے، اور جن کو دنیوی امور میں کوئی درک حاصل ہے اُن کا دینی علم اُن کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہے ——— یہ دوسرا بنیادی

مسئلہ ہے ہمارا۔ کہ کس طرح ان دو متوازی سلسلوں Parallel Streams, کو ہم دوبارہ ایک مشترکہ سلسلے Main Stream, میں بدل دیں۔

رفقائے محترم! تیسرا مسئلہ میری نگاہ میں تعلیم کے معیار کا ہے۔ ہم نے تعلیم کو محض معلومات منتقل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے، جبکہ تعلیم دراصل ذہن کو جلا بخشنے والی قوت کا نام ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب غیر ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا تھا۔ اور یہ جبر بہ اختیار ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ یہ قوم کبھی خود سوچنے کے لائق نہ بنے۔ ساری توجہ ایک بیرونی زبان کو سمجھنے کی سعی نامشکور میں صرف ہو۔ اور نفسِ مضمون Content, اصل علم اور اس کے مغز تک رسائی نہ ہونے پائے۔ اس کے نتیجے کے طور پر تقلیدی ذہن پیدا ہُوا۔ سمجھنے کے بجائے رٹنے کا رواج ہوا۔ علم اور فکر کے جن ذرائع Sources, جن منابع کی طرف رجوع ہُوا۔ وہ ایسے تھے جن پر اس نام کی پرچھائی بھی نہ پڑی تھی، یہ وہ چیز تھی، جس کے نتیجے کے طور پر تعلیم کا اعلیٰ معیار نہ قائم ہو سکا۔ قوم کے نوجوانوں میں تخلیقی صلاحیت نہ بیدار ہو سکی۔ اُن کا ایک تقلیدی ذہن، ایک تقلیدی مزاج بن گیا۔ اور یہی سامراجی قوتیں چاہتی تھیں۔ کہ یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں، اپنے انداز میں سوچ نہ سکیں۔ تقسیم کے بعد منجملہ اور اسباب کے تعلیم کے معیار کو برابر پست سے پست تر کرنے میں اس عامل کا بڑا دخل رہا۔ لیکن مَیں انصاف نہیں کروں گا اگر مَیں یہ کہوں کہ صرف یہی اُس کا سبب ہے، اس کے اور اسباب بھی ہیں اور آج عالم یہ ہے کہ ہمارا طالب علم صنعت بردار تو ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن علم کی دولت سے محروم رہتا ہے۔ ڈگریاں ہمارے نام کے ساتھ لگ جاتی ہیں لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد بھی ہم علوم و فنون کے اوپر مہارت و قدرت حاصل نہیں کر پا رہے۔ اور وہ افراد جنہیں ممتحن رہنے کا موقعہ ملا ہے اور مَیں نے بائیس ۲۲ سال اسی دُنیا میں گزارے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ تعلیم کا معیار بڑا پست ہے اور اس کے سب سے زیادہ شاہد آپ حضرات ہیں۔

چوتھا مسئلہ جو تعلیم کا میری نگاہ میں بنیادی مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم کا تعلق معاشرہ اور

معیشت سے منقطع ہوگیا ہے جو علوم ہم پڑھا رہے ہیں۔ جو مضامین ہم پڑھا رہے ہیں، جو کتابیں ہم پڑھا رہے ہیں، جو موضوعات Themes, ہم لا رہے ہیں۔ وہ موضوعات جن پر ہمارے ملکوں میں ریسرچ ہو رہی ہے ہم ایک لمحے کے لیے یہ نہیں سوچتے کہ ان کا کیا تعلق ہے ہمارے معاشرے سے، ہمارے ملک کی معیشت سے، ہمارے مسائل سے۔ تعلیم انسان کو اس لائق بناتی ہے کہ وہ حلال روزی کما سکے۔ تعلیم معاشرے کو اس لائق بناتی ہے کہ جو اس کی فنی، اُس کی سائنسی، اُس کی تکنیکی، اُس کی صنعتی۔ اس کی معاشی ضرورتیں ہوں، سکولوں اور کالجوں سے نکلنے والی یہ نسل ان ضرورتوں کو پُورا کر سکے۔ لیکن ہمارا عالم یہ ہے کہ ایک طرف صنعتی ترقی کے لیے، فنی ترقی کے لیے، سائنسی ترقی کے لیے ہمیں جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ میسّر نہیں۔ اور دوسری طرف دگرگوں بردار افراد کی ایک فوجِ ظفر موج ہے جو بے روزگار پھر رہی ہے، جو معیشت میں اپنا مقام نہیں پا سکتی اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے تعلیم کو معاشرے اور معیشت سے مربُوط نہیں کیا بلکہ یہ مختلف سمتوں میں ترقی کر رہی ہے۔ میری نگاہ میں یہ چار بنیادی مسائل ہیں۔ جو اس وقت نظامِ تعلیم کو درپیش ہیں اور جس وقت میں یہ بات کہتا ہُوں کہ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید جو میرے ذہن میں ہے، وہ ان چاروں مسائل کا صحیح حل ہے ——— وہ حل جو اسلام کے دیئے ہُوئے اصُولوں اور اقدار کی روشنی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

رفقائے محترم! اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جسے میں عرض بھی کر چکا ہُوں اور پھر میں اس کا اعادہ کرتا ہُوں وہ ہے اسلامی نظامِ تعلیم کے تصوّر کو صحیح صحیح سمجھنا۔ مجھے یہ بات افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ آج بھی اسی سلسلے میں ژولیدہ فکری اور پریشان خیالی پائی جاتی ہے اور جہاں تک میں نے اندازہ کیا ہے اُس کے دو پہلو بڑے اہم ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظامِ تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ تعلیم کے ساتھ دینیات کا اضافہ کر دیا جائے، کچھ ناظرہ قرآن پاک پڑھا دیں، بڑی خوش نصیبی ہو گی اگر اس کا ترجمہ بھی ہم پڑھا دیں۔ دینیات کی تعلیم پہلی سے دسویں جماعت تک ہو جائے۔ اسکولوں میں جو اسمبلی ہوتی ہے اُس میں کچھ اچھی باتیں کہہ دی جائیں۔ مَیں پُورے ادب سے یہ عرض کروں گا کہ ان میں سے ہر چیز مفید اور ضروری ہے لیکن یہ اسلام کا تصوّرِ تعلیم نہیں۔ اسلام جس تعلیم کی تلقین کرتا ہے

جس چیز کو ہم اسلامی نظامِ تعلیم کہیں گے وہ یہ ہے کہ ہم جس دائرۂ علم میں بھی کام کر رہے ہوں، جو ذہن، جو فکر، جو سوچ، جو انداز وہاں پیدا (Develop,) ہو، وہ اسلام کی اقدار سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس کے لیے بلاشبہ ہمیں قرآن پاک بھی پڑھانا ہے، ہمیں دینیات کی تعلیم بھی دینی ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہے کہ ہر علم کے اندر ہم اسلام کے نقطۂ نظر اور اسلام کی فکر کو جاری و ساری کریں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم دنیوی علوم کو ترک کر دیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو وہ اسلام کی رُوح سے آشنا نہیں ہے۔ یہ سائنس، یہ سائنسی علوم، سوشل سائنسز انسانیات (Humanities,) یہ سارے ہمارے علم ہیں۔ یہ تاریخ کا ایک سانحہ ہے کہ آج لادینی تمدّن اُن کا علمبردار بنا ہُوا ہے۔ اور اُس سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ان علوم کو جو خدا کی بندگی اور انسانیت کی خدمت کے لیے تھے اِس لادینی تمدّن اور تہذیب نے خدا سے بغاوت اور اور انسان کُشی کے لیے استعمال کیا۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کے دیئے ہُوئے اقدار کی روشنی میں سوچنے اور اُن بنیادوں پر فکرِ انسانی کی تشکیلِ جدید کرنے کا کام انجام دیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم جدید معاشیات کو جانیں، ایڈم سمتھ سے لے کر ہیرلڈ اور فیلڈمین تک جو باتیں کہی گئی ہیں، اُن سے ہم واقفیت پیدا کریں، لیکن صرف واقفیت ہی پیدا نہ کریں بلکہ اس کا ہم تنقیدی جائزہ لیں اور یہ نہ سمجھیں کہ جو کچھ وہاں سے آتا ہے وہ حق ہی حق ہے بلکہ ہم قرآن اور حدیث کی دی ہوئی اقدار کی روشنی میں اس کو پرکھیں کہ اس میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے۔ اور پھر معاشی فکر کو اسلام کی بنیادوں پر مرتب و مدوّن کریں اور اس کی روشنی میں اپنے معاشی مسائل اور انسانیت کے معاشی مسائل کا حل تلاش کریں۔ یہی کام ہمیں سیاسیات میں کرنا ہے۔ یہی ہمیں عمرانیات میں کرنا ہے، یہی ہمیں فلسفہ میں کرنا ہے، یہی ہمیں ادب میں کرنا ہے، یہی ہمیں ڈیموکریسی میں کرنا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں ہمیں یہ کام انجام دینا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ایسا آپ کریں گے تو پرائیویٹ سیکٹر (نجی دائرے) میں کیا ہوگا۔ بلاشبہ یہ ایک دائرۂ انسان کی فکر اور کوشش کا ایسا ہے جسے آپ اقدار سے آزاد (Value Neutral,) کہہ سکتے

ہیں۔ اور اسلام اُسی دائرے میں ہمیں بھرپور حصہ لینے اور خدمت سرانجام دینے پر اُکساتا ہے۔ لیکن یہ تمام مساعی ایک وسیع تر نظامِ اقدار (Value Framework,) میں واقع ہوتے ہیں۔ مَیں ایک مثال دیتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ طب (Medicine,) میں کیا ہوگا۔ مَیں کہتا ہوں کہ طب (Medicine,) کی بنیاد تصورِ انسان پر ہے۔ آج جو میڈیسن کے نظام (Systems,) پائے جاتے ہیں، ان پر غور کیجیے، اُن کا تجزیہ کیجیے۔ آپ پائیں گے کہ وہ کچھ بنیادی مفروضات (Assumptions,) کے اوپر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر طبِ اسلامی۔ اس میں مرض کو مریض سے جُدا کر کے نہیں پڑھا جاتا۔ مریض کی شخصیت، اس کا کُلّی وجود، اُس کا مزاج، اور اس فریم ورک میں مرض کا مطالعہ کیا جاتا ہے جبکہ میڈیکل سائنس کی وہ ترقیات جو یورپ کے کرداری نفسیات (Behaviouristic Psychology,) کی بنیاد پر Develop. ہُوئی ہیں۔ اُن میں کُلّی علیحدگی (Total Abstraction,) مرض کی مریض سے کی جاتی ہے اور یہ بالکل متطابق (Consistent) ہے۔ یہ کرداری نفسیات Behaviouristic Psychology, کی یہ بنیادی اقدار (Values,) ہیں۔ یہ بات کہ علاج میں دوا اور دُعا دونوں کا دخل ہے۔ ایک مادّہ پرستانہ نظامِ طب میں اس کا کوئی تصوّر نہیں جبکہ ایک اسلامی فریم ورک میں یہ بڑی اہم چیز ہے۔ آخر مسلمانوں نے طب کے میدان میں غیر معمولی خدمت (Contribution,) کی ہے اور یورپ میں جو میڈیکل سسٹم اس وقت ہیں اُن کی داغ بیل مسلمانوں نے ڈالی۔ دورانِ خون (Circulation of Blood,) مسلمانوں نے دریافت کیا تھا، بلڈ پریشر مسلمانوں نے دریافت کیا تھا۔ سرجری میں مسلمانوں نے ترقی کی تھی لیکن تمام اپنے فریم ورک میں رکھ کر۔ کہا جاتا ہے کہ طبیعیات (Physics,) میں کیا ہوگا۔ ٹھیک ہے مَیں بھی واقف ہُوں کہ فزکس اور کیمسٹری میں ایک وسیع دائرہ ایسا ہے کہ جہاں آپ معروضی تجزیہ (Objective Analysis,) کر سکتے ہیں۔ لیکن کہنے والے یہ بھُول جاتے ہیں کہ یہی فزکس انیسویں صدی میں مادّے (Matter,) کے ایک خاص تصوّر پر مبنی تھی جو وجودِ مطلق (Final Substance,) سمجھا جاتا تھا اور جس کی کچھ خاص خصوصیات (Characteristics,) متعیّن کی گئی تھیں۔ بیسویں صدی میں ایکس رے کے تصوّر ایٹم کی تقسیم (Splitting of Atom,)

اضافیت (Relativity,) کوانٹم فزکس (Quantum Physics,) کی ترقیات (Developments,) کے بعد مادّے اور انرجی کی کوئی تفریق باقی نہ رہی اور فزکس کے بنیادی تصورات ایک دوسرے انداری یا فکری فریم ورک کے اندر سوچے جانے لگے۔ انجینئری بلاشبہ اس میں بھی ایک دائرہ ایسا ہے جو خالص ٹیکنیکل اور ٹیکنالوجی تعلقات (Relationships,) پر مبنی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا مطالعہ کیجیے۔ سول انجینئرنگ میں مسلمانوں نے کیا خدمات (Contributions,) انجام دیں اور کس طرح اُن کی اقدار (Value,) کو متاثر کیا، ——— یہ روشنی کا تصور، روشنی کو کس طرح فنِ تعمیر میں استعمال کرنا ہے، کشادگی (Openness,) کا تصوّر، یہ سارے کے سارے کیسے آئے۔ ان کی اساس توحید پر، ہمارے نظامِ اقدار پر ہے۔ تو میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی نظامِ تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ جہاں دینیات اور اسلامیات کی معقول تعلیم کا انتظام ہو وہیں ہر علم جو ہمارے دائرے میں داخل ہے اور ہمیں اُس میں خدمت (Contribution,) کرنا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمیں فکرِ انسانی کی تشکیل جدید کرنی ہے۔ اسلام کی اقدار (Values,) کی روشنی میں اور ہمارا نظامِ تعلیم پورے طور پر اسلامی اُس وقت ہوگا جب ہم یہ کُلّی تشکیلِ نو (Transformation,) انجام دیں۔

ایک دوسری تصوری (Conceptual,) غلط فہمی جو پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسے اسلامی نظامِ تعلیم کوئی بنی بنائی ڈھلی ڈھلائی شے ہے جسے آپ آنکھیں بند کرکے کسی ایک خاص لمحے موجودہ نظام کے اوپر مسلط (Impose,) کر سکیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلامی نظامِ تعلیم ایسی کوئی چیز نہیں۔ اسلام نے ہمیں تعلیم کے بارے میں یہ واضح رہنمائی دی ہے، جس طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور اس سلسلے میں مزید چیزیں موجود ہیں۔ ان تمام کی روشنی میں ہمیں اپنے تعلیمی حالات کا جائزہ لے کر ایک نئے رُخ کی طرف ترقی کرنی ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم دراصل ایک مسلسل عمل (Process,) ہے۔ منزل کا تعین کر لیجیے۔ وہ بنیادی حُدود جن کے اندر رہ کر ہمیں کام کرنا ہے، انہیں متعین کر لیجیے۔ اس کے بعد پھر ایک بڑی مدت لگے گی۔ ہمیں آہستہ آہستہ یہ نئی تعمیر کرنے کے لیے کوشش کرنی ہوگی۔ ایک مرتبہ یہ عمل (Process,) شروع ہو جائے گا تو اُس کے

نتائج بھی نکلنے شروع ہو جائیں گے لیکن یہ ایک بڑی مستقل کوشش ہے جس پر ہمیں عمل کرنا پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ قرآن پر غور کریں تو آپ یہ پائیں گے کہ قرآن نے زندگی کا تصور ہمیں یہی دیا۔ اسلام کا آغاز ہوتا ہے اللہ کی وحدانیت کو قبول کرنے سے۔ ایمان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ زبان سے ادا کرنے سے لیکن جہاں یہ کہہ دینے سے آپ مسلمان ہو گئے وہیں ایسا نہیں ہے کہ آپ کو جیسا مسلمان ہونا چاہیے وہ آپ بن گئے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کلمے کے پڑھنے سے آپ کی زندگی میں ایک عمل شروع ہو گیا۔

اور یہ عمل (Process) جاری رہے گا آپ کی انفرادی زندگی میں، آپ کی اجتماعی زندگی میں آپ کی گھریلو زندگی میں، آپ کی باہر کی زندگی میں، حتیٰ کہ آپ ربِ اعلیٰ سے جا ملیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ ایک طرف آغاز کرا دیا اس کلمے سے، دوسری طرف کہہ دیا کہ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ اور حضورؐ نے فرمایا کہ مومن وہ ہے جس کی زندگی کا آج کا دن کل سے بہتر ہے۔ اور جس کا کل اُس کے آج سے بہتر ہے یعنی ایک عمل (Process) ہے جس میں کہ ہمیں مستقل منہمک رہنا ہے اور یہی چیز ہے اسلامی نظامِ تعلیم۔ میری نگاہ میں وہ ایک عمل (Process) ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بنا بنایا ڈھانچہ (Structure) ہے جو آپ مسلط (Impose) کر دیں۔ اس کے واضح خد و خال ہیں، اس کے واضح اصول ہیں، لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک لا متناہی عمل ہے جس میں آپ کو مستقل مصروف رہنا ہے تو اس طرح یہ کوئی بنی بنائی چیز نہیں ہے بلکہ اسے ہمیں بنانا ہے۔ اس کی ہمیں حفاظت کرنی ہے، اسے ہمیں جلا بخشنا ہے، اور اسے ہمیں تکمیل کی طرف لے کر جانا ہے۔

ان تصوری (Conceptual) مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد میں ایک اور چیز کی طرف بھی سرسری ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اسلامی نظامِ تعلیم کی راہ میں حائل ہے اور وہ ہے ایک ایسا مرض جو بدقسمتی سے ہماری قوم میں پچھلے سالوں میں پروان چڑھا ہے اور وہ ہے مادہ پرستانہ ذہنیت۔ اقدار میں ایک بڑی بنیادی تبدیلی اس زمانے میں واقع ہوئی، اور وہ یہ ہے کہ انسانی اعلیٰ مقاصد،

حلال و حرام کا احساس، خیر و شر کی تمیز، اپنی ذات کے مقابلے میں اصولوں کے لیے زندگی گزارنا، یعنی اس سے دراصل ہمیں محروم کیا گیا۔ تحریکِ پاکستان کا سب سے بڑا (Contribution,) ہماری زندگی میں یہ تھا کہ اُس نے ہمیں انفرادی منفعت سے اُٹھا کر خیر اور شر اور قوم کے لیے اور ملک کے لیے اور دین کے لیے کیا اچھا ہے اور مَیں اُس کے لیے کیا قربانی دے سکتا ہوں اور کیا کوشش کر سکتا ہوں، وہ ہمیں اس بلندی پر لے آئی لیکن اس زمانے میں جو ترقی معکوس ہوئی، اُس کے نتیجے کے طور پر ہم پھر اُس مقام پر آ گئے کہ ذاتی منفعت، سہولتوں کا حصول، یہ ہر ایک کی دلچسپی ہے۔ اکبر الہ آبادی کو داد دینی پڑتی ہے اُن کی بالغ نظری کی مغربی تہذیب اور مادہ پرستانہ تہذیب کی کشمکش سے جو نیا ذہن بن آتا ہے اُسے انہوں نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے کہ ؎

نہیں اس کی کوئی پُرسش کہ یاد اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

تو یہ دراصل اقدار (Values,) ہیں اور اس زمانے میں جو کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ یاد اللہ سے تنخواہ پر لے آئے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ تنخواہ اہم نہیں ہے لیکن زندگی کے یہ دو نقطہ ہائے نظر ہیں، اور اِس وقت جو مادہ پرستانہ ذہنیت کو ایک بالادستی ہمارے ملک میں، ہماری قوم میں حاصل ہوتی ہے۔ اُس کے نتیجے کے طور پر اسلامی نظامِ تعلیم، اس کا فہم، اس کی طرف بڑھنا، یہ راستے کی بہت بڑی مشکل ہے اس لیے جہاں تصوری طور سے (Conceptually,) ہمیں واضح (Clear) ہونا چاہیے کہ اسلامی نظامِ تعلیم کیا ہے وہیں ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس کے لیے سرپھروں کی، دیوانوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ذاتی منفعت کی سطح سے اُٹھ کر، اقدار (Values,) کی پرستش، نیکی کے حصول، خیر کے فروغ، معروف کو پھیلانے کے جذبے کو لینا پڑے گا اور یہی وہ نیا ذہن ہے جس سے آپ اسلامی نظامِ تعلیم کو قائم کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد مَیں بہت مختصر عرض کروں گا کہ عملی مشکلات موٹی موٹی کیا کیا ہیں۔ عملی مشکلات میں ایک بڑی مشکل ہے اس وقت کا نظامِ تعلیم، اس کے ضابطے، اس کے ڈھانچے (Structure)

اس کی پالیسز، اس کے ادارے (Institutions,) ہیں۔ بلاشبہ اسلامی نظامِ تعلیم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بلڈنگوں کو ترک کر دیں گے، چٹائیوں پر بیٹھنے لگیں گے، لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض مصنوعی ترجیحات (Priorities,) اس زمانے میں ہیں جن میں بلڈنگ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ معلّم اور تعلیم کی اہمیت سب سے کم۔ کروڑوں روپیہ آپ خرچ کریں گے نئے نئے کیمپس بنانے میں، لیکن جو تعلیم کا نفسِ مضمون (Substance,) ہے اور تعلیم کو جو پہنچانے والا ذریعہ ہے معلّم، اس کو آپ نظر انداز کریں گے۔ یہ دراصل ایسی ترجیحات ہیں جو غلط پلاننگ، غلط نظام کی بنیاد پر یہاں قائم ہوتی ہیں اور مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

دوسری بڑی رکاوٹ ان افراد کی کمی ہے جن میں ایک طرف اسلام کی صحیح لگن (Commitments,) موجود ہے، اور دوسری طرف ان میں وہ صلاحیت جو اس عظیم کام کو سرانجام دینے کے لیے درکار ہے۔ یاد رکھیے اسلام وہ مذہب نہیں جو یہ سمجھتا ہو کہ دنیا کو ترک کرنا، دنیا سے ناواقف ہونا، یا بدھو ہونا کوئی خوبی کی بات ہے۔ اسلام حکمت کا مذہب (Religion) ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اپنے گھوڑوں کو تیار رکھو۔ وہ مستعدی کا، وہ قوت کا، وہ غلبہ حاصل کرنے کا، وہ ایجاد اور اکتشاف کا خواہاں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بہترین صلاحیتیں ہوں ہم میں، اور بہترین دینداری اور عبدیت کا احساس ہو ہم میں۔ ان دونوں کو ملا کر کے اسلام ایک نئی قوت پیدا کرتا ہے۔ اور آج اُس کا فقدان ہے۔ یہ ایک اور بڑی عملی دشواری ہے۔

تیسری چیز مادّی اور مالی وسائل کی کمی بھی ہے۔ مجھے اس بات کا پُورا پُورا احساس ہے کہ ہم ایک غریب ملک کے باشندے ہیں اور ایک غریب ملک کی حیثیت سے ہمیں اپنے وسائل کی قلت کا احساس ہونا چاہیے۔ لیکن سانحہ ہمارا یہ ہے کہ ہم نے زندگی گزارنے کا جو ڈھنگ بنایا ہے، جو ہماری سوچ اور فکر ہے وہ یہ نہیں کہ ہم ایک غریب ملک ہیں اور ہمیں ترقی کرنی ہے بلکہ ہر چیز میں ہم عیش و عشرت، تعیُّش، لذت پرستی، اور اس کی جو علامات (Symbols,) ہیں ان کو ہم محبوب رکھتے ہیں۔ میری نگاہ میں ہمیں ایک دوسرے انداز میں وسائل کا استعمال (Resource Mobilization,)

کرنا ہوگا ہمیں اپنی ترجیحات (Priorities) بدلنی ہوں گی، اور مجھے یہ یقین ہے کہ اس قوم میں ایمان و اخلاق کی حس موجود ہے۔ یہ چنگاری ہے لیکن راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوتی ہے۔ آیئے غلط ترجیحات کی راکھ کے اس ڈھیر کو ہٹائیں۔ اس چنگاری کو پھر ہوا دیں تاکہ وہ چنگاری ایک نئی قوت بن جائے۔ بلاشبہ یہ مادی مشکلات ہیں۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ تعلیم کے نظام میں، تعلیم کے کارپردازوں میں، اس کی پالیسیاں بنانے والوں میں، اس کی پالیسیاں نافذ کرنے والوں میں، مولانا محمد علی مرحوم کا یہ جملہ مجھے یاد آرہا ہے کہ تعاون (Assistance) کم ہے اور مزاحمت (Resistance) زیادہ ہے۔

لیکن اس کے باوجود جو چھپی ہوئی قوت موجود ہے اور جس کا مظاہرہ آپ نے تاریخ میں بار بار دیکھا، خواہ وہ ۴۶ء ہو، ۶۵ء ہو یا ۷۱ء، مجھے یقین ہے کہ اُس قوت کو ہم متحرک (Mobilize) کر سکتے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اُس قوت کو متحرک (Mobilize) کیا جائے۔ اور اس کام کو مَیں کہتا ہوں کہ ہمیں ایک نئی تعلیمی تحریک کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہم اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے سہارے نہیں، اللہ پر بھروسہ کرکے جو تھوڑی بہت قوت ہمیں حاصل ہے اُسے ہم اس کام کے لیے تج دیں اور اس میں استاد، طالب علم، حکومت اور والدین ان چاروں قوتوں کو ہمیں ملانا ہوگا، اور اگر سب اس طرف آنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اُس پر آپ پریشان نہ ہوں، اگر چند سرپھرے بھی اس کام کو کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو یہ کام ہو سکتا ہے۔ اور آپ نے ایک قلیل مدت میں اتنی بڑی جمعیت کو مجتمع کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ کام کیا جا سکتا ہے۔

آیئے وہ تعلیمی تحریک برپا کریں جس کے نتیجے کے طور پر اسلامی نظامِ تعلیم قائم ہو سکے اور اسلامی نظامِ تعلیم نام ہے ایک نئے مقصد کا، سوچنے کے ایک نئے انداز کا۔ منزل کے ایک نئے شعور کا، اسلامی نظامِ تعلیم نام ہے اس بات کا کہ ہم تعلیم کے مواد (Content) پر دوبارہ غور کریں اور اسے اسلام کی روشنی سے منور کریں، اس کے لیے نصاب بدلنے ہوں گے۔ اس کے لیے نئی کتابیں لکھنی

ہونگی، اس کے لیے لیکچرز حضرات کو، مُعلّمین کو پڑھانے کا اسلوب بدلنا ہوگا۔ یہ نام ہے اُستاد کے ایک نئے رول کا۔ کہ استاد صرف اس لیے نہیں ہے کہ طلبہ کو مصروف (Engage) رکھے، یا اس لیے نہیں ہے کہ اپنی تنخواہ وصول کرے۔ استاد اس لیے ہے کہ وہ اس قوم کو نبی اکرمؐ کے اُسوہ کی روشنی میں، اس لیے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مَیں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس نبوت کی ذمّہ داری کو ادا کرے۔ یہ ہیں اسلامی نظامِ تعلیم کے معنی، اور بلاشبہ اس میں اچھی بلڈنگیں بھی ہونگی۔ اس میں اچھی لائبریریاں بھی ہونگی اس کے اندر تجربہ گاہیں (Laboratories) بھی ہونگی۔ اس کے اندر ہمیں ہر چیز کا خیال رکھنا ہوگا۔ لیکن ہماری ترجیح (Priority) یہ ہونی چاہیے کہ ہمیں ایک نئی نسل تیار کرنی ہے جو ایک طرف آج کے علوم سے آراستہ ہو لیکن اس کے ساتھ جس کا اخلاق اسوۂ نبویؐ کی بنیاد پر مرتب ہو۔ اور جسے دین کا علم حاصل ہو اور اس قوت کو جو علم اور سائنس فراہم کرتی ہے۔ وہ اللہ کے دین کی خدمت اور سربلندی کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے اور اس طرح پاکستان دُنیا کے لیے روشنی کا ایک مینار بنے اور شہادتِ حق کی ذمّہ داریاں ادا کرے۔ یہ ہے اسلامی نظامِ تعلیم اور اس کے لیے ایک مُلک گیر تعلیمی تحریک کی ضرورت ہے جس میں حکومت اور عوام، طلبہ اور اساتذہ سب شریک ہوں۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پُورے خلوص کے ساتھ ہم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس سمت میں آگے بڑھیں۔ ہمیں دُشواریوں کا احساس ہے لیکن یہ کام اتنا اہم ہے کہ خواہ کیسی ہی چٹانیں راہ میں حائل ہوں، ہمیں اس سمت میں آگے بڑھنا ہے اور نئی تعلیمی پالیسی میں پہلی مرتبہ پاکستان کی تاریخ میں کھلے الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ ہمارا مقصد تعلیم کو اس نئے عینیّت (Idealism) سے آشنا کرنا ہے۔ اور جو تھوڑی بہت خامیاں تھیں، کل کابینہ نے اس تعلیمی پالیسی پر نظرِ ثانی (Review) کرتے ہوئے بالکل کھُلے انداز میں اس بات کا اظہار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد ایک نئی مسلمان نسل تیار کرنا ہے۔ تعلیم کے معیار کو بلند کرنا ہے لیکن اصل اہمیت اس کے اخلاق اور اس کی رُوح کو دینی ہے۔ اور اُس نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ ذریعہ تعلیم قومی زبان کو بنانا ہے اور صرف سرکاری سکولوں اور کالجوں میں ہی نہیں بلکہ اس ملک کے تمام اداروں میں اور اس کا نفاذ اگلے

تعلیمی سال سے شروع ہوگا اور بتدریج تمام اداروں میں ذریعۂ تعلیم قومی زبان بنے گی۔ اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ عورتوں کی تعلیم بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی مردوں کی اور اس کے لیے مخلوط تعلیم کے طریقے کو ترک کیا جائے گا اور عورتوں کو اُن کی ضرورت کے مطابق ہر سطح پر تعلیم فراہم کی جائے گی اور جو بھی مالی رکاوٹیں (Constraints,) ہوں، انشاء اللہ اگلے مالی سال میں دُوخواتین یونیورسٹیاں ضرور قائم کی جائیں گی۔ اس طرح جو خامیاں تھیں اُن کو دُور کیا جا رہا ہے اور مزید جو بھی کمزوریاں یا مسائل ہیں، انشاء اللہ اساتذہ، طلبہ، حکومت اور والدین ان کے تعاون اور ان کی شرکت (Participation.) سے ان تمام خامیوں کو دُور کیا جا سکے گا۔

آیئے ہم اللہ تعالیٰ سے عہد کریں کہ جس جذبے کے ساتھ یہ ملک قائم کیا گیا تھا، اُسی جذبے کے ساتھ ہم اسے اسلامی بنیادوں پر از سرِ نَو مضبوط اور مستحکم کریں اور اس جدوجہد میں ہمیں کامیابی ہو یا اس کے لیے کام کرتے ہُوئے ہم کام آجائیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

کتابخانہ محمد ہارون موسیٰ